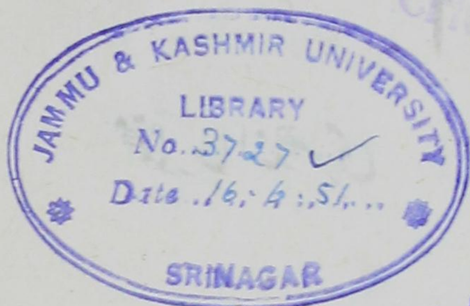
تلاطم

مخمور جالندھری

مکتبہ جدید لاہور



اقبال کے ابلیس کے نام۔

کوآپریٹو کیپٹیل پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام چوہدری بشیر احمد چھپکر مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوئی۔

فہرس

پیش لفظ

بیشتر نقادوں کے نزدیک مخمور جالندھری گردن زدنی اور سوختنی ہے۔ کیونکہ وہ بار بار یہ راگ الاپتا ہے ؎ اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی۔ وہ قابلِ تعزیر ہے کیونکہ اقبال کے الفاظ ہیں وہ کہتا ہے ؎ نیا دور ہے ساز بدلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ زندگی کو زندگی سے بہتر کیوں نہیں دکھاتا۔ اور سب سے بڑا گناہ یہ کہ وہ سوچتا کیوں ہے۔ جس ملک میں نوّے فیصدی لوگ جاہل اور توہم پرست ہوں، وہاں سوچنا گناہِ عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔ ہندوستان میں دروغ گوئی سے لیکر جعلسازی تک تمام گناہوں کو معاف کیا جا سکتا ہے لیکن سوچنا، کہ گناہِ کبیرہ ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہتے ہیں اکبر الہ آبادی کے رقیبوں نے تھانے میں رپٹ لکھوائی تھی۔ اکبر خدا کو اس زمانے میں یاد کرتا ہے۔ مخمور جالندھری کے رقیبوں کی رپٹ کا خلاصہ یہ ہے۔ کم بخت مخمور ہندوستانی ہونے کے باوجود سوچتا ہے۔ لیکن مخمور صرف سوچنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اوروں کو بھی سوچنے کی دعوت دیتا ہے یعنی بیک وقت دو گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے

اگر اُس کے پاس کلوروفارم، افیون یا خواب آور دوا ہوتی تو شاید ہندوستان میں

اُس کی پرستش کی جاتی۔ کیونکہ ہندوستانی عوام اونگھنے کو سوچنے پر ترجیح دیتے ہیں لیکن
اُس کے منہ میں بگل اور ہاتھ میں نشتر ہے۔ اس حالت میں اُسے کون خوش آمدید کہنے کو
تیار ہوگا۔ اس حالت میں اُسے گالیاں دی جائیں گی خوش قسمت اس لیئے کہ ذہن کو جھنجوڑنے
والے کی سزا سقراط سے لیکر حکیم فرائڈ تک زہر کا پیالہ ہے منٹو اور مخمور کو یہ پیالہ حقیقت پسند
پیش کرتے ہیں اور داغ کے معشوق کی طرح تاکید بھی کرتے ہیں کہ "اسے پینا ہوگا"

مختصر یہ کہ ہمارا سماج جس پر ہم سب کو فخر و ناز رہا ہے مدت سے مفلوج ہو چکا ہے
ذہنی، اخلاقی اور سماجی اعتبار سے اس کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ یا پٹنے والا ہے۔ اس
کے پھیپھڑے سڑ چکے ہیں۔ وہ صبح و شام خون تھوکتا ہے۔ اس میں اب اتنی سکت بھی
نہیں رہی کہ وہ کھل کر کھانس سکے۔ غربت، جنسی فاقہ کشی، جہیز کی بدعت، ذہنی آوارگی،
اجتماعی انتشار، سیاسی غلامی، توہمات کتنے ہی روگ ہیں جو اسے گھن کی طرح کھائے جا رہے
ہیں۔ لیکن ہر چند کہ بیمار لبِ گور ہے۔ اربابِ وطن کی دانشمندی کا یہ عالم ہے کہ بالیں پر
بیٹھ کر ڈاکٹر ہمکو گالیاں دے رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ "ہم مانتے ہیں مریض کے پھیپھڑے
تباہ ہو چکے ہیں، نبضیں ڈوب چکی ہیں۔ سانس سینے میں الجھ رہی ہے لیکن خدا کے لئے یہ کہکر
کہ اسے تپِ دق ہے اس کی تندرستی خراب نہ کرو۔" اربابِ وطن کی یہ تقریر سنکر مخمور کا
ردِ عمل کبھی طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی حزن و یاس کی پناہ لیتا ہے۔ طنز
مخمور کی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ اور اس کی بیشتر نظمیں ہمارے سماج پر مسلسل طنز کی
حیثیت رکھتی ہیں۔ طنز کے علاوہ اُس کے کلام کی نمایاں خصوصیت رومانی افسردگی ہے جو
کبھی انگریزی شاعر میتھو آرنلڈ اور کبھی ن۔م۔ راشد کی یاد دلاتی ہے۔

مخمور کو جزئیات پر حیرت انگیز عبور حاصل ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملوں سے
ایسے حیرت انگیز خاکے تیار کرتا ہے کہ اُس کے مشاہدہ کی داد دینی پڑتی ہے۔

مخمور کی نظموں کے بیشتر ہیرو جنسی فاقہ کشی کے شکار ہیں۔ جس کے لئے عموماً حقیقت پسند
مخمور کو موردِ الزام گردانتے ہیں۔ وہ اس سے پوچھتے ہیں کہ اُس کی نظموں کے نوجوان

بھکارنوں کو دیکھ کر کیوں مچل جاتے ہیں۔ کیوں وہ فلم ایکٹرس جون کرافورڈ کی تصویر دیکھتے وقت اُس کے لبوں کا بوسہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ جنسی آسودگی کی داستانوں میں کیوں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ رجعت پسند مخمورؔ سے اس بات کا جواب طلب کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ پوچھتے ہیں کہ ایک فاقہ کش سامانِ خورد و نوش دیکھ کر کیوں اُس پر جھپٹنا چاہتا ہے۔ دراصل مخمورؔ مجرم ہے اور یہ سماج جس نے یہ حالات پیدا کئے ہیں کہ اکیلی اور بے بس عورت کو دیکھ کر نوجوان کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔ بے قصور ہے۔ کیا ہی اچھّا ہوتا اگر مخمورؔ کی نظموں کے ہیرو بھکارنوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے یا جیسا کہ گاندھی جی فرماتے ہیں آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا لیتے۔ مگر کاش!! زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اور مخمورؔ مبالغہ کا عادی نہیں۔ وہ غلاظت کو غلاظت، گناہ کو گناہ اور مجرم کو مجرم کہنے کا عادی ہے۔ وہ غلاظت کے ڈھیروں کو مخملیں چادر سے ڈھکنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ غلاظت سے پیدا ہونے والے کیڑے تھوڑے ہی دنوں میں چادر کو چھلنی کر دیں گے۔ وہ گناہ کو گھسیٹ کر تنقید اور مشاہدہ کی روشنی میں لانا چاہتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ انسان، انسان ہیں۔ فرشتے نہیں۔ البتہ پنڈت، ملّاں اور رجعت پسند نقاد اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مخمورؔ نے موضوع کے علاوہ ہیئت میں بھی قابلِ قدر تجربے کئے ہیں۔ اُس نے اکثر ردیف اور قافیہ کی آہنی زنجیروں سے شاعری کو آزاد کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور یہ فعل شاید رجعت پسندوں کی لغت میں سب سے زیادہ قابلِ مذمت ہے۔ رجعت پسندوں کی رائے میں وہ شاعر ہی کیا جو قاری کے ہاتھ میں قافیہ اور ردیف کا جھنجھنا نہیں تھماتا۔ جس کی جھن جھن میں وہ اس طرح مستغرق ہو جائے کہ یہ سوچنے کے قابل ہی نہ رہے کہ جھنجھنا کیا کہہ رہا ہے۔ جس شاعری میں گھنگروؤں کی جھنکار، بانسری کی تان، طبلے کی تھاپ سنائی نہیں دیتی وہ شاعری ننگِ ادب ہے۔ مخمورؔ کی مقبول بحر بلینک ورس ہے یعنی وہ بے نظیر بحر جس نے ہومر، ڈانٹے، شیکسپیئر اور ملٹن کو شہرت و دوام بخشی۔

مخمورؔ کی بلینک ورس میں سحر ہے۔ ترنّم ہے روانی ہے۔ جس میں شعریت کے جملہ اوصاف

بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مخمورؔ فرسودہ ترکیبوں اور پامال استعاروں سے قطعاً احتراز کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ نئی ترکیبوں، نئی تشبیہوں سے اپنے فکر کو مزین کرتا ہے۔ مخمورؔ کو ہمیشہ تازہ اور توانا تشبیہوں اور استعاروں کی تلاش رہتی ہے۔ اُس کا صحت مند تخیل روندی ہوئی ترکیبوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

رجعت پسند نقادوں کی رائے میں مخمورؔ ابلیس ہے جو انسانوں کو بہکاتا ہے۔ اور میری دانست میں ہندوستان کو ایسے ہی ابلیسوں کی ضرورت ہے۔ معلم اخلاق تو ہزاروں مل جائیں گے۔ مگر مخمورؔ ایسا ابلیس اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔

"ادبِ لطیف" فروری ۴۵ء

کنہیّا لال کپور

مداوا

زیست کیوں موت کے مایوس تخیّل میں کٹے

تہ و بالا کئے بیٹھا رہوں دنیا کب تک

اپنی بیمار تمنّا کو سسکتے دیکھوں

لئے بیٹھا رہوں قسمت کا جنازا کب تک

اپنے واماندہ عزائم کو توانا کر لوں

راہ جو سامنے آجائے گوارا کر لوں

تند موجیں بھی تو ڈھلوان کے رُخ بہتی ہیں
نشّے کا کیا ہے ــــ یہ چڑھتا ہے اُتر جاتا ہے
میں ہی کیوں سعیٔ غمِ انجام میں مصروف رہوں
ابر بھی کوہ سے ٹکرا کے پلٹ آتا ہے۔

آہ و فریاد بھی نشتر ہے مگر تیز نہیں
میں ہی کیوں یاس سے آمادۂ پیکار رہوں
جادۂ زیست کے ہر گام پہ بیٹھی ہے اجل
میں ہی کیوں شام و سحر خوف سے بیدار رہوں

فعل سرزد نہیں ہوتا کوئی فطرت کے خلاف
میں بھی بیخوابیٔ دائم کا مداوا کر لوں،
سنگِ اُمّید پہ رکھّی ہے دو عالم کی اساس
میں بھی اُمیدِ شکستہ کا بھروسا کر لوں

غم کو — کیوں عمر گنوانے کا ذریعہ سمجھوں

تہ و بالا کئے بیٹھا رہوں دُنیا کب تک

یاس و حرماں کے خیالات کی یورش سے بچوں

روز و شب ایک ہی شکوے کا اعادہ کب تک

زنگ آلودہ تصوّر کو درخشاں کر لُوں

اپنی بجھتی ہُوئی خلوت میں چراغاں کر لوں

حُسن کے عیش کدے اور طلسماتِ حیات

انکے ہوتے ہوئے کیوں زیست سے مایُوس رہوں

جسم، احساس، طلب، یاد، جوانی، سپنے

انکے ہوتے ہوئے کیوں رنج سے مانوس رہوں

جانتے بوجھتے کیوں دل کو نہتّا کر لوں

چار سُو ملتا ہے کثرت سے تمنّا کا مواد

یاد رکھّوں کہ بہر حال مجھے جینا ہے

دل بیک وقت ہے غم ساز، مسرّت ایجاد

جانتے بُوجھتے کیوں دل کو نہتّا کر لوُں

راہ جو سامنے آجائے گوارا کر لوُں

ہمایوں سالنامہ ۴۴ء ۲۵ جون ۴۳ء

تماشائی

اُس کے منہ سے پھُول جھڑے ـــــ تاریکی میں طوفان اُٹھا

چاند ستارے خواب سے جاگے ہیں بھی لئے ارمان اُٹھا

جیون سونا ـــــ راس نہ آیا ہر سانس ایک وبال ہوا

لمحہ لمحہ ـــــ میری تنہائی کا ماہ و سال ہوا

جنگل جنگل، صحرا صحرا میں بھٹکا پامال ہوا

آئی پھر رس راگ کی رانی ـــــ نین کٹیلے کنڈل بال

خوشبو، خوشبو ـــــ جسم چھریرا، فتنہ فتنہ بانکی چال

جادو کالا چاہت والا ـــــ کتنے ستم ایجاد ہوئے

جھیلوں، دریاؤں کے کنارے حشر کدے آباد ہوئے

جاگ رہا تھا ــــ اُس کا فتنہ، وہ فتنہ پرداز ہنسا

اُس نے سوچا معمولی آویزش ـــــ یہ کیا بات بنی
کیچڑ کے کیڑے میری عظمت کے قائل ہو نہ سکے
دریا اور پربت بھی ان کی راہ ہیں حائل ہو نہ سکے
انہیں پھلوں کے عوض کھلاؤ آج ہی سے ہیرے کی کنی
یہ کیا آخر یاد کریں گے انہیں دکھاؤ ـــــ اہرمنی"
بجلی کوندی، شعلے لپکے چاروں طرف سے برسی آگ
عقل کی اُلجھن ـ مکر کا جادو، حرص و ہوا کی ٹکھی لاگ
صبر و قناعت کے ہتھکنڈے، جبر و مشیّت کے کھڑاگ
اُس نے ایسے شگوفے چھوڑے ہوش و حواس فرار ہوئے
دنیا اک "رن بھومی" نکلی سب محوِ پیکار ہوئے

اِک نے شہر پہ ڈاکہ ڈالا اک نے گلی میں مانگی بھیک
اپنے مقبوضات کی اک نے دور دور تک کھینچی لیک
اِک نے کہا "مجھ سا نہیں کوئی کیوں نہ جہاں پر راج کروں"
اک بولا "میں عیسیٰ دوراں ـــ دردِ جہاں کا علاج کروں"
اِک بولا "میں آلِ ملائک ملکِ بشر تاراج کروں"
جسم بنے فوارے خوں کے پیلی دھرتی لال ہوئی
وہ فتنہ پرور گھبرایا جب مَیں نے یہ چال چلی

دُور شفق کی گہری سُرخی ہے یا اُس کے دل کی آگ
برق کی لہریں اُسکے تیور ـ آڑے ترچھے جھومتے ناگ
دیکھ رہا ہوں چھڑا ہوا ہَیں اس کے گھر میں دیپک راگ
بسمل ـ قاتل، دونوں گھائل کون بتائے پھوٹے بھاگ

ساقی نومبر ۴۴ء ۲۸ فروری ۴۴ء

پاگل

جا رہا ہے بڑبڑاتا، رقص کرتا بے ہراس
اِک جنونی، بے شعور، آوارہ سر، خبط الحواس
کر رہی ہیں دیر سے مبہم اشارے ـــــ انگلیاں
باندھ رکھّی ہیں کمر سے کس کے سن کی رسّیاں
جا رہا ہے ـــ یُوں فتورِ عقل و دانش کا شکار
جس طرح وحشی بگولا تند جھونکوں پر سوار
گریہ اُس کا جیسے گیدڑ نصف شب کو چیخ اُٹھیں
قہقہہ جس طرح اولے ٹین کی چھت پر بجیں
ایک لمحہ کم نہیں ہوتا ہے چلّانے کا زور ـــ

رات کو جیسے سمندر سے اُٹھے مہمل سا شور

یہ پروں کی سر پہ ٹوپی ہے کہ تاجِ زرنگار

رعب اتنا جیسے اک معزولِ شوکت شہریار

ہو رہی ہے چیتھڑوں سے اس کے یہ رمز آشکار

چشم بینا ہیں لباسِ زندگی ہے تار تار ـ

پوٹلی میں جمع کچھ کوڑا ہے اور کچھ خاک ہے

جس سے ظاہر ہے کہ دامانِ جہاں ناپاک ہے

پُرزے پُرزے کر رہا ہے چند اوراقِ کتاب

جس کا مطلب ہے کہ مہلک ہے تمدّن کا شباب

پٹّیاں لپٹی ہوئی ـــ ہیں اس حقیقت کا نشاں

کاٹ دو جکڑے ہوئے ہیں رُوح کو جو رسّیاں

شان سے تھامے ہوئے ہے ہاتھ میں لمبا سا بانس

جس کا مطلب ہے چبھو دو سینۂ غاصب میں پھانس

صاف ہے تقریرِ بے معنی سے پیدا یہ سوال
حورِ آزادی کا کیا ممکن ہے باتوں سے وصال؟

سرخ دھبّے جسم پر غمّاز ہیں اس راز کے
جسمِ انسانی نہیں لہو و لعب کے واسطے

سر پٹک کر کہہ رہا ہے یہ بھیانک داستاں
ضربِ سر سے توڑ دو سنگیں قفس کی تیلیاں

اس کا ہر فعل ایک نکتہ — ہر اشارہ کیمیا
دیکھنے میں ایک پاگل اصل میں راز آشنا

کِس قدر چھائی ہوئی ہے روح پر بے چارگی
ہر قدم پر دے رہا ہے دعوتِ آوارگی

ساقی نومبر ۱۹۴۰ء ۱۵ ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

اُس کا عشق

ہنستے ہوئے چہرے کو الم ناک بنایا
گالوں کی پُر انوار شفق ــــ پڑ گئی پھیکی
لہجے میں اُداسی کے تأثّر کو ملایا ــــ
پھر اُس نے مجھے عشق کا افسانہ سنایا
سچ ہے کہ گنہ اور محبّت نہیں چھپتی ــــ

"وہ دیکھتی ــــ خاموش مجھے دیکھتی رہتی
میں دیکھتا ــــ خاموش اُسے دیکھتا رہتا

آنکھیں تھیں کہ خوابوں کے فسوں ساز جزیرے

میں بیخود و سرشار وہاں گھومتا رہتا

پیدا تو کئے اُس کی نگاہوں نے فسانے

لیکن مرا پیمانۂ جذبات نہ چھلکا

چھیڑا نہ تنفّس کی مجھے گرم ہوا نے"

ڈوبی ہوئی آواز میں افسانہ ہوا ختم

اُس نے مجھے تحسین طلب انداز سے دیکھا

جیسے مجھے پریوں کی سنائی ہو حکایت

جذبات کے عالم میں مجھے ناز سے دیکھا

جیسے میں لرز جاؤں گا اور چونک پڑوں گا

چاہا مرے دل نے۔ کہ اُسے کوئی دعا دے

اے کاش اُسے کوئی جنوں کا رجوانی —!!

اُلفت کے مقاماتِ حقیقی کا پتا دے

یہ عشق جو آج اُس کے تصوّر کی ہے زینت

اس کو کوئی اُس بھوُ کے پہلو میں بٹھا دے

اُجڑے ہوئے سینے میں سمن زار کھلا دے

سالنامۂ ادبِ لطیف" سنہ ۴۵ء ۳۱ جنوری سنہ ۴۵ء

نیا مکان

"چلو مکاں کی مصیبت سے بھی نجات ملی،
یہ خوابگہ، یہ کچن، غسلخانہ اور بیٹھک —!!
مَیں سوچتا ہوں مجھے سوچنے کو بات ملی،
ہوئی ہیں صرف مشقّت کی کوششیں انتھک
نظر رُبا در و دیوار کے بنانے میں —
یہ قمقمے — یہ تمدّن کی اختراعِ جدید
بڑھی جلالتِ ادراک، تیرگی نہ مٹی
یہ سیڑھیاں ہیں فراست کے پیچ کا مظہر

حیات کی کوئی پیچیدگی نہ دور ہوئی

مگر میں ــــ محو ہوں ادبار کے مٹانے میں

یہ سیڑھیاں ہیں جو ــــ ان پر سے گر پڑے کوئی

بُری گھڑی نہ خدا لائے جانے کب آجائے

یہ چکنا فرش ــــ اسے دیکھتا رہے کوئی،

جو کل کو پاؤں تمہارا کہیں پھسل جائے

خدا کرم کرے میرا تو دم نکل جائے

میں سوچتا ہوں مجھے سوچ کا جنوں جو ہوا

یہ میرے ذہن کا ماحول پُر فسوں جو ہوا

یہ میرا ذہن ــــ مجھے لے چلا ہے دُور کہیں

وہاں ــــ جہاں کبھی پہلے بھی تھا مکاں اپنا

فلک کے سائے میں ہم تھے کبھی پناہ گزیں
یہ فرشِ خاک تھا قالینِ زرفشاں اپنا
یہ مہر و ماہ یہ تارے تھے اپنے گھر کے دیئے
گُل و گیاہ سے لبریز پُر بہار زمیں
جلو میں حُسن لئے دعوتِ نظر کے لئے
کبھی ہمارے لئے تھی نشستگاہِ حسیں،
یہ زلف پیچ سے بیگانہ موجِ صہبا تھی
کہ جس کا برسوں مری اُنگلیاں رہیں نشانا
یہ تیری ہمدمی اک کیفیتِ نشہ تھی
جہاں بھی چاہنا فوراً وہیں چلے جانا
وہ صبح ساحلِ دریا — وہ شامِ زیرِ چنار
گذر گئی وہ مسرّت کی صبح و شام اپنی

ہمارے دوش پہ جب تھا نہ جبر و قدر کا بار

چلو، چلو یہ حکایت ہے تلخ کام اپنی

اُٹھو، اٹھو در و دیوار کو سجانا ہے،

مکاں کو گہنوں لدی اک دلھن بنانا ہے

ہمایوں جولائی ۴۴ء ۱۵ مارچ ۴۴ء

اشتعال

تمہارے گھر کی کوئی سیڑھیاں نہیں چڑھتا
اب "آفتاب" کے کوٹھے پہ ہُن برستا ہے
جو کاروبار یونہی چند روز سرد رہا
تو اس محل کا کرایہ کہاں سے آئے گا؟
اِس اہتمام سے دھونے پڑینگے ہاتھ تمہیں
یہاں کھنکتے تھے ساغر یقیں نہیں آتا
یہاں مہکتے تھے غنچے گماں نہیں ہوتا
یہ لڑکیوں کی جوانی ہے دھوپ ساون کی

نہ جانے کون سا گھُن ان کو چاٹ جاتا ہے!!

یہ نجمہ تم جسے پچھلے ہی سال لائے تھے

اسے پسند نہ کرتا تھا خوش نظر شوہر

روایتوں میں گرفتار ہے گھروں کی فضا!!

یہ مست آنکھیں ـــــ مہکتی ہوئی شراب کے جام

یہ جسم طشتری میووں کی اور لذائذ کی،

یہاں ہلاک ہوتی ہیں لطافتیں ان کی،

کہ ایک محبسِ سنگیں ہیں گھر کی دیواریں

ادائیں جن کا یہاں قدر داں نہیں کوئی

نکل کے گھر سے پرستار ڈھونڈ لیتی ہیں

کوئی ستاروں پہ کوئی فدا ہے پھولوں پر

کسی کو صرف شگفتہ دلی سے واسطہ ہے

کوئی حجاب کا، کوئی وفا کا دیوانہ

چکور چاند کا شیدائی پھول کا بھونرا

کئی ہیں ایسے جو مُردار سُونگھتے بھی نہیں

مگر گدھوں کی یہی ہے نشاطِ کام و دہن

پھٹے پُرانے پہنتا نہیں کوئی ملبوس،

مگر پُرانے لباسوں کی بھی دکانیں ہیں

یہ مجسمہ حسن کے پرستار اب نہیں آتے

جو آج اس کو کسی اور شاخ پر لے جاؤ

ہزاروں پوچھتے آئیں گے آشیاں کا پتہ

ہر ایک چیز کا اپنا مقام ہوتا ہے —

"گلاب" — سلمیٰ کو پچھلے ہی سال لائی تھی

بچاری ساس سے تنگ آ کے بھاگ آئی تھی
روائتوں میں گرفتار ہے گھروں کی فضا
یہ اختیار و حکومت کا جذبۂ خود سر!!
مخالفت کبھی برداشت کر نہیں سکتا۔
یہ تخت و تاج تو فرعونیت کے خالق ہیں
کلاہِ زر...... کسی مجبور کو جو پہنا دیں
وہ بھُول جائے گا مجبور تھا کبھی وہ بھی
یہ اختیار سکھاتا ہے خود فراموشی
ہر ایک ساس جو ـــ اب ساس ہے بہو تھی کبھی
ہر ایک ساس پہ گذری تھی جو بہو بن کر
اُسی کا ردِّ عمل ظلم بن کے ٹوٹتا ہے،
مگر ہر ایک بہو گھر سے کب نکلتی ہے

روایتوں میں گرفتار ان گھروں کی بہو

خموش رہتی ہے اور ظلم سہتی جاتی ہے

روایتوں میں گرفتار ان گھروں کی فضا

ہمیشہ صبر و قناعت کا درس دیتی ہے

جو "سلمیٰ" چند برس اور صبر کر لیتی۔!!

کسی بہو کی بنی ہوتی آج ساس ضرور

یہاں تو چند ہی دن مہر نیمروز رہی

سُنا ہے اس کو پُرانا بخار آتا ہے

یہ "ناظمہ" بھی تو جہیز کی لائی تھی موچن

بچاری گہنوں کے لالچ میں بھاگ آئی تھی

دماغ ــــ پالتا رہتا ہے خواہشاتِ عجیب!!

جو چیز پاس ہو اس کی کچھ اہمیّت ہی نہیں
ہمیشہ دوسروں کے گھر کے جھاڑ، یہ فانوس!!
نشست گاہ کا بکھرا ہوا اسر و سامان،
یہ رکھ رکھاؤ — لباسوں کی یہ تراش خراش!!
دکھائی دیتی ہے اکثر نظر فریب ہمیں
بچارے ترسے ہوئے، بلبنوا، تہی داماں!!
جو دوسروں کے محل کا جلال دیکھتے ہیں
اور اپنی جھونپڑی اک پل میں پھونک دیتے ہیں
یہ جھونپڑے کے مکیں کو اگر مکاں دے دیں
مکان پا کے — محل کا یہ خواب دیکھے گا
کچھ اتنی دامنِ حرص و ہوا میں وسعت ہے
بچاری گہنوں کے لالچ میں گھر سے آئی تھی

اسی طلب میں وہ سرگشتہ و ملول رہی

وہ گھنے آج بھی تھے اُس کا منتہائے طلب!!

بڑا کٹھن ہے حصولِ طلب میں جاں دینا

خدا بچائے کسی کی جوان موت نہ ہو

گلی سڑی ہوئی لاش آج بھی ہے زخمِ نگاہ

"چمیلی" —— ایک بڑے گھر کا مال لائی تھی

بچاری سوت سے تنگ آ کے بھاگ آئی تھی

یہاں دکھوں کے ستائے ہوئے ہی آتے ہیں

روایتوں میں گرفتار ان گھروں کی فضا

یہی ہے اصل میں پروردگارِ رنج و محن!!

چھپی ہوئی ہے رقابت میں آگ نفرت کی

انہی شراروں سے سینے الاؤ بنتے ہیں،

انہی خراشوں سے اِس دل میں گھاؤ بنتے ہیں،
اگر نہ آتے کبھی اشتعال میں جذبات
تو بیشمار غمِ روزگار کیوں ہوتا ——!!
یہ گال اور یہ لب، یہ اُبھار سینے کا
یہ جاں گداز ادا، یہ نگاہِ عشوہ طراز
یہ پُر بہار تبسّم، یہ دعوتِ بے باک!!
کبھی خیال کیا ہے کہاں سے آتے ہیں؟
انہی گھروں سے انہی اضطراب خانوں سے
انہی بھڑکتے، دہکتے ہوئے الاؤں سے
انہی گھروں سے جہاں مائیں بہنیں رہتی ہیں،
انہی مکانوں میں ہوتی ہے پرورش انکی
یہ آج بیسوا، عصمت فروش ہے لیکن

یہ کل کسی کی بہن تھی، کسی کی بیوی تھی،

یہ کون جانتا ہے — یہ کسی کی ماں بھی ہو —!!

مگر یہ بیسوا ہے آج ایک بیسوا ہے

اِسی لئے کہ یہ جذباتِ مشتعل اپنے

روایتوں سے یہ جکڑی ہوئی فضاؤں میں

بجھا کے رکھ نہیں سکتی تھی ایک پل کے لئے۔

اِسی لئے یہ جب آئی تھی ایک شعلہ تھی،

جو اِس چمیلی کے ہاں چند روز اور رہی

بچاری سوگ میں گھل گھل کے بجھ ہی جائیگی

یہ "آفتاب" کی شمشاد، شعلہ گوں تتلی

سُنا ہے بوڑھے میاں سے جھگڑ کے آئی ہے

شباب، کون بڑھاپے کی نذر کرتا ہے

یہ آفتاب کے کوٹھے کے قہقہوں کا سرود

دل و نگاہ پہ اک ضربِ سخت ہے کہ نہیں

پڑوسیوں کے گھروں میں بہار کا عالم —!!

تمہارے گھر میں خزاؤں کی گرد سامانی

دلِ خراب کو اب تابِ انتظار نہیں

اُٹھو اُٹھو کہیں کوئی لگے گی ہاتھ ضرور

کوئی تو آئے گی اُکتا کے اور گھبرا کر

روایتوں میں یہ جکڑی ہوئی فضاؤں سے

سنو رُکا بھی ہے دنیا کا کوئی کام کبھی —؟

تمہارے گھر میں سکوت اور ملال کا کیا کام

یہاں تو قہقہے برسیں گے، جام چھلکیں گے

"ادبِ لطیف" افسانہ نمبر ۴۴ء   ۲ر اپریل ۴۴ء

اُس کی باتیں

"کہوں کیا — مَیں اپنی تباہی کا حال

زمانے کا ہر لمحہ ہے انقلاب

کبھی شادمانی — کبھی اضطراب

گنوایا نہیں مَیں نے یونہی شباب

یونہی مَیں نے دولت نہیں کی خراب

پکائے نہیں دھوپ میں اپنے بال

مجھے غم نہیں مَیں جو کنگال ہوں

وہ دیکھا ہے حسنِ جمیل و کثیف

پڑھے ہیں وہ اسرارِ جنسِ لطیف

نہیں میرا اس فن میں کوئی حریف

مجھے کر نہیں سکتا کوئی خفیف

مَیں اِس بیکسی میں بھی خوشحال ہوں

کیا ہے جواں تتلیوں کا شکار

ہیں اس راستے میں فراز و نشیب

ہے ہر گام پر اک دامِ فریب

جو بیمار پیتا ہے جامِ شکیب

اُسے روز ملتے ہیں کھانے کو سیب

یہ نسلِ حسیں ہے بڑی ہوشیار

یہاں اوّلیں شرط ہے احتیاط

اگر سیدھی سادی سی آجائیں بات

سمجھ لو کہ قبضے میں ہے کائنات

ضروری ہے بس اک یہی داؤ گھات

کہ ٹالی نہ جائے کوئی ان کی بات

سدا گرم رہتی ہے بزمِ نشاط

اگر شوخ و طرّار آجائیں ہات

تو پھر خود کو اک شاہزادہ بتاؤ

نڈر ہو کے بڑھ چڑھ کے باتیں بناؤ

انہیں ملنے رنگیں لباسوں میں جاؤ

انہیں جھوٹے کچھ کارنامے سناؤ

کہ ان کے لئے ہیں یہی داؤ گھات

پسند آئی ہیں جو دریچہ فروز

تو دوانکے عشوؤں کی دولت سے داد

گنواؤ نہ کھا کر فریب اعتماد

یہ اُن سے کہو — "ہم کو رکھو گی یاد"

تمہاری ہی خاطر ہے کل جبا تذاد"

یونہی کٹتے ہیں انکے ہاں چند روز"

مجھے اس کی باتوں پہ حیرت ہوئی

ٹپکتا تھا انداز سے طمطراق،

یہ تھا میرا اک دوست شستہ مذاق،

تکلّف جو رکھتا تھا بالائے طاق

ہوا جس سے ملنے کا آج اتّفاق

مجھے جس سے ملکر مسرّت ہوئی!

شاہکار فروری ۴۵ء ۱۹ر جنوری ۴۳ء

پھر اُسی طوفان میں

سازکے سہمے ہوئے، ٹھٹھرے ہوئے تاروں پر
اُنگلیوں کے یہ جھلکتے ہوئے مضراب پڑیں
ٹھہری ٹھہری ہوئی خاموش فضائیں پھر سے
رقص کرتے ہوئے اجسام کے گرداب پڑیں
بھر کے رکھ دو مرے ساغر میں لہکتا پانی
پاؤں تخیّلِ سبک رَو کے ذرا شل ہو جائیں
کیف سے بھیگ کے پلکیں ذرا بوجھل ہو جائیں
روحِ مسموم میں نغمے بھی ذرا حل ہو جائیں
سازِ کے پردوں میں دبکی ہوئی تانیں نکلیں

ڈگمگاتے ہوئے کولہوں کو مچلنے دو ذرا۔

ان تھرکتے ہوئے جسموں کے سمن زاروں میں

رکی تھامی ہوئی نظروں کو ٹہلنے دو ذرا۔

میری مغموم جوانی کو بہلنے دو ذرا۔

عرصۂ زیست کا جانباز سپاہی ہوں میں

مَیں نے ہر ہر قدم اک دادِ شجاعت دی ہے

وقت کے افسرِ جابر نے مجھے خوش ہوکر

چند لمحوں کے لئے مہلتِ عشرت دی ہے

میری یہ فرصتِ کم عمر نہ غارت ہو جائے

مجھ پہ ظاہر نہ ہو یہ بات کہ میری ہی طرح

دل گرفتہ ہو، سیہ بخت ہو برباد ہو تم!!

ساز کی گونج سے اور رقص کے عالم سے مجھے
تنگ نہ ہونے دو کہ نغمہ نہیں فریاد ہو تم۔!!

جانے پھر کب مجھے فرصت ہو فراغت ہو مجھے
تازہ دم ہو کے مجھے جانا ہے ان راہوں میں
جن میں اُلجھا ہوا مشکل سے کوئی لوٹتا ہے
جیسے تدبیرِ مشیّت کی کڑی باہوں میں

جو کبھی پھر ملی فرصت تو ضرور آؤں گا،
اس طرب گاہ سے دو چار ہی قدموں پہ تو ہے
عرصۂ زیست — مری رزمگہِ کرب و بلا
سنگِ در سے میں گذرتے ہی پہنچ جاؤں گا
رقص کرتے رہو گاتے رہو یونہی میں چلا

ادبِ لطیف جنوری ۴۵ء ۲۲ دسمبر ۴۴ء

قناعت

مسلّط تجھ پہ ہے اِک غلبۂ واماندگی — جیسے
فضا بیہوش ہو جاتی ہے آندھی کے گذرنے پر
بگڑتی جا رہی ہے پیکرِ مرمر کی زیبائش،
کنارے کا ہو جیسے گاؤں دریا کے اُترنے پر
نگاہوں کے لئے تخریب — منزل ہو نہیں سکتی
کبھی دیکھا ہے مُرجھائے ہوئے پھولوں پہ بھونروں کو؟
بیاباں میں بھی کوئی مرمریں ایوان بناتا ہے —؟
کسی اندھے کنوئیں پہ بھی کبھی دیکھا ہے پیاسوں کو؟

کوئی لاشوں کے خدّ و خال کے بھی گیت گاتا ہے؟

بہاریں گلستاں ہی دعوتِ گلگشت دیتے ہیں،
مصائب کی، حوادث کی تمنّا کون کرتا ہے۔؟
سکوں حسن اور عظمت ہی دلوں کی آرزوئیں ہیں
کوئی اپنی خوشی سے بھی ستم سہتا ہے مرتا ہے؟
مَیں اکثر سوچتا ہوں لاش سے چمٹا رہوں کبتک
ترے اس دامنِ صد چاک میں سمٹا رہوں کبتک
مَیں اکثر سوچنے لگتا ہوں ان تاریک راتوں میں
تجھے تیرے مقدّر کے حوالے کیوں نہ کر جاؤں
اور اپنے آپ کو بھی سونپ دوں قسمت کے ہاتوں میں
بہ رخصت ڈھال تو لے گی مقدّر کے نئے رستے

بنے گا کیا جو یہ بھی راستے دشوار تر نکلے

مقدّر کا بھروسا کیا، یہ راس آئے نہ راس آئے

سفر پر جب کبھی نکلے ہمیشہ سوچ کر نکلے

کبھی پوُری ہوئی ہیں رات کی سوچی ہوئی باتیں

دلائل بھی کبھی آمادۂ اقدام ہوتے ہیں ـــــ؟

کہاں جاؤنگا ـــ میرا دم تری باہوں میں نکلے گا

انہی باہوں میں جو سرچشمۂ آرام ہوتی ہیں

جو فرحت بخش، جو غارت گر آلام ہوتی ہیں

"ادب لطیف" فروری ۴۵ء ۲۹ مئی ۴۴ء

خدا بچائے

اسپتال — آماجگاہِ رنگ و صحت اسپتال!!
یورشِ غم کی شفا، زورِ مرض کا اندمال،
ماہرِ فن ڈاکٹر — نبّاض ہیں ہشیار ہیں،
شوخ نرسیں — چارۂ امراض ہیں طرّار ہیں
بوتلوں میں بند ہے — سیلِ شباب، آبِ حیات
شیشیوں میں قید ہے مہلک وباؤں کی نجات
جن سے چھن جاتی ہیں کیف و تازگی کی جنّتیں،
ان کو ملتی ہیں دوبارہ زندگی کی نعمتیں —
توڑتی ہیں دم یہاں خود جاں شکن بیماریاں

موت ہی پر چھا رہی ہیں موت کی پر چھائیاں
خوش فضا، ماحول آسودہ، عمارت پُر شکوہ
ہر قدم پر مستعد خدمت گذاروں کے گروہ
لیکن اِس رنگیں جہنّم سے خدا سب کو بچائے
دوست تو پھر دوست ہیں اللہ دشمن کو نہ لائے
جیب بھاری ہو تو کھلتی ہیں دوا کی شیشیاں
پھر تو نرسیں بھی نہیں دیتی ہیں بھرنے سسکیاں

وہ محل سی زرد رُو کوٹھی — عدالت گاہ ہے
ظلم کے تازہ شکاروں کی حفاظت گاہ ہے
بام و در پر ہے تکلّف شان سے چھایا ہوا
رعبِ حاکم سے ہے گوشہ گوشہ گرمایا ہوا

جُرم استادہ ہیں سرنگوں خوف سے سہمے ہوئے
اور سزا کا پیرہن قانون ہے۔ پہنے ہوئے
قتل، شورش اور دھوکوں سے یہاں منہ زرد ہیں
ظالموں، چوروں، جفاکاروں کی نبضیں سرد ہیں
روز ہوتے ہیں یہاں اخلاق کُش فتنے ہلاک
بیگناہوں کے کئے جاتے ہیں چہرے تابناک
لیکن اس رنگین مذبح سے خدا سب کو بچائے
صبر کی سل سینے پر رکھ لے، یہاں ہرگز نہ آئے
چند ٹکڑوں کے عوض انصاف بکتا ہے یہاں
عدل کھا کر زخم رشوت سیسہ در پا ہے یہاں
فتح پانے والے بھی برباد ہوتے ہیں یہاں
مسکرانے والے بھی قسمت کو روتے ہیں یہاں

"شاعر" جولائی سنہ ۲۰ء

۱۱ مئی سنہ ۲۰ء

آفتاب

ساغرِ شرق سے بلّور لنڈھاتا اُٹّھا
ناچتا، گاتا ہؤا ایک دفعہ پھر آیا
نُور میں ڈوبا ہؤا، دُھوم مچاتا اُٹّھا
تمتمایا ہؤا، بھڑکا ہؤا، رخشندہ شباب،
سعیِ ناکام کو دھرانے چلا آیا ہے
ہنستے چہرے پہ نہیں کل کی ہزیمت کا عذاب
سرمئی حسن ـــ سمیٹے ہوئے آنچل اپنا
چھیڑتی، کوندتی نظروں کی نہ لاتے ہوئے تاب

اپنی بکھری ہوئی زلفوں کو سنوارے اُٹھا

جانے کس پردے میں شرمایا ہوا جانے لگا

غازۂ نور سے دُنیا پہ نکھار آنے لگا

"ھمایوں" اپریل ۴۵ء

۱۵ فروری ۴۵ء

وَردان

سادھو خدا رسیدہ ہیں گنگا کے گھاٹ کے
ہنس کے دیا تھا "لاج" کو ایک آم کاٹ کے
کھاتے ہی، پہلے ہفتے ہوئی وہ اُمید سے

اشنان ہردوار کا بھی بے اثر نہیں
آئی تھی پچھلے سال نہا کر شکنتلا ـــ!!
گودی میں اُس کی چاند سا لڑکا ہے کھیلتا،

سادھو "پڑاؤ والے" بھی ہیں کامِل علوم
اُن کی بھی "جھاڑ پھونک" کی ہے بے پناہ دھوم

مانے جو میری بات تو سُن اے منورما — !!

اِک دن پھلوں کی ٹوکری لے جا کے پاؤں چوم

(۲)

سادھو "پڑاؤ والے"...... لنگوٹی ہے زیبِ تن

سُلفے کے کش لگاتے ہیں اور رہتے ہیں مگن

ہر کش کے بعد۔ "بمّ مہا دیو"۔ کی صدا

برماتی ہے پلے ہوئے چیلوں کی انجمن

شاید یہ نشّہ ہے کہ ریاضت کا بانکپن —!!

مالائیں، چمٹے، گھنٹیاں، کشکول، راکھ، سنکھ

بانسوں کی جھونپڑی کا ہے بکھرا ہوا سنگار

یہ معرفت کدہ ہے، یہ ہے منزلِ مراد —!!

ہوتا ہے بار بار جہاں فضلِ کردگار!

یہ بیٹھے بیٹھے، اونگھتے چیلے بھی خوب ہیں
جب دیکھتے ہیں دُور سے آتی —— منورما —!!
جانے گرو کو چھوڑ کے جاتے ہیں سب کہاں

(۳)

سادھو "پڑاؤ والے"۔ بڑے کارساز ہیں
بٹیا ترا بہت ہی حسیں ہے منورما —— !!
اُن کا سا بال بال — اُنہی کا سا رنگ روپ
بارہ برس کی آہی گئی کام آج دوڑ دھوپ

۱۴ را پریل ۴۵ء "کتاب" اگست ۴۵ء

کُندن

کندن — ساٹھ برس کا بوڑھا چھوٹے قدم اُٹھاتا ہے
صبح سویرے — دھیرے دھیرے پُل پر بیٹھنے آتا ہے
دائیں۔ بائیں، اُس کی نگاہیں دوڑتی ہیں کچھ ڈھونڈتی ہیں
تیس برس پہلے کا زمانہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے،
بیتے دنوں کا تصوّر — دل کے دُکھ کو اور بڑھاتا ہے
دُنیا اِک دِن اُس کی تھی، یہ دنیا آخر کِس کی ہوئی ؟
کندن چلتے چلتے، بیٹھے بیٹھے بھی تھک جاتا ہے
جیسے اُسے قربِ منزل سے ڈر لگتا، خوف آتا

کندن دھیرے چلتا ہے اور تیزی سے گھبراتا ہے
ننھّے بچّوں کی پھُرتی چالاکی پر جھنجھلاتا ہے
"ایک مصیبت، ایک قیامت نئے زمانے کی اولاد!!
اگلے وقت کی عظمت اور شرافت سب کر دی برباد۔"
اکثر اگلے وقت کی باتیں ہنس ہنس کے دُہراتا ہے
اس کی کمر کا گہرا خم ــــ اِس موقع پر تن جاتا ہے۔
جب کوئی اسکول کو جاتی پھُول سی شعلہ گوں لڑکی
دیکھتا ہے بول اُٹھتا ہے "یہ کیسا زمانہ آیا ہے
رنگ روپ کے بیچنے والی کا سا سوانگ رچایا ہے
اچّھا ایشور تیری مرضی یہ بھی مصیبت سہنا تھی
شکر ہے اگلے وقتوں کی بیٹی کے ایسے ڈھنگ نہ تھے

لاج ہی اُس کا جوبن تھی، اور لاج ہی اُس کا گہنا تھی"
لیکن دوشیزہ کے سراپا میں کندن کھو جاتا ہے

کندن — صبح سویرے نہر کے پُل پر بیٹھنے آتا ہے
اکثر اگلے وقت کی باتیں ہنس ہنس کے دُہراتا ہے
اس کی کمر کا گہرا خم — اس موقع پر تن جاتا ہے
کتنی خوش اسلوبی سے اپنی خفّت کو چُھپاتا ہے

"ھمایوں" جنوری ۴۵ء　　　　۱۸ راکتوبر ۴۴ء

جہنّم

آخری وقت بھی معصُوم پشیماں نہ ہوئے

اِک تاسّف کی دمِ نزع دعا پڑھ لیتے

سجدہ اک فرطِ ندامت سے ادا کر دیتے

مطمئن ـــ صاحبِ جبروت یونہی ہوتے ہیں

اپنے قدموں پہ وہ سجدوں کے نشاں چاہتے ہیں

اپنی مخلوق کے ہونٹوں پہ فغاں چاہتے ہیں

آخری وقت کا اظہارِ ندامت ـــ سجدہ

بخشتا بادۂ کوثر کے چھلکتے ہوئے ـ جام

تمتماتے ہوئے کھمبوں پہ نہ چڑھتے اجسام

پیپ اور قے کے نہ ہاتھوں میں پیالے ہوتے

بچھوؤں، سانپوں کے ــــ منہ میں نہ نوالے ہوتے
جسم اُبلتی ہوئی دیگوں میں نہ سڑتے گلتے
مونگ چھاتی پہ ہتھوڑوں سے نہ بھُنتے دلتے

اپنے خود ساختہ احکام کی سرتابی پر
کتنی مذموم، حیا سوز سزا دیتے ہیں
جسم جلتے ہوئے کھمبوں پہ چڑھا دیتے ہیں
ایسے خودسر ہیں کہ خودسر نہیں ہونے دیتے
آہِ مظلوم کو نشتر نہیں ہونے دیتے
ایک ہی ظلم کے ہیں زیر اثر ارض و سما،
ایک ہی رنگ کا قائم ہے دوعالم میں نظام
اس دہکتے ہوئے محبس کا جھلستا ماحول

یہ شررزار، — سزاگاہ، یہ عبرت کا مقام
دیکھتا ہوں میں یہاں عقل وخرد — زینتِ دام
یہ سزایافتہ، مجبور، ملول اور مقہور
اِن میں شاعر ہیں، مصوّر ہیں، جہاں گیر بھی ہیں
مُوجدِ عالمِ نَو — صاحبِ شمشیر بھی ہیں
دیوِ تخریب بھی ہیں، ماہرِ تعمیر بھی ہیں
فنِ تخلیق کا ہر جوہرِ قابل ہے یہاں
یہ بغاوت کے، تمدّن کے فسوں گر فنکار
اِن کا اکثر ہؤا کرتا ہے جہنّم ہی مقام
کبھی زنداں میں کبھی دار پہ ہے ان کا قیام!!
رحم کرتا ہے کبھی اپنے مخالف پہ کوئی — ؟
اکثر اُٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیتے ہیں

اپنے خود ساختہ احکام کی سرتابی پر
کتنی مذموم حیاسوز سزا دیتے ہیں
دست و پا باندھ کے غاروں میں گرا دیتے ہیں
تاکہ آئندہ ۔۔۔ کبھی جرأتِ پرواز نہ ہو

آخری وقت کا اظہارِ ندامت ۔۔۔ سجدہ
میں تاسّف کا گنہگار نہیں ہو سکتا،
آخری وقت ۔۔۔ میں غدّار نہیں ہو سکتا،
دست و پا باندھ کے کر دو مجھے غاروں کے سپرد
میرے احباب، مرا راستہ تکتے ہوں گے
کر بھی دو مجھ کو جہنّم کے شراروں کے سپرد

سالنامہ "شاہکار" ۱۹۴۵ء ۔۔۔ ۳۱ مئی ۱۹۴۴ء

بلیس چھہرے

فروغِ آفتاب اُن گرم ہونٹوں کا تبسّم ہے
ابھی تک جن سے اُٹھتی ہوں مسلسل لمس کی آنچیں
ہوا کے مست جھونکے ہیں مئے گلرنگ کے چھینٹے
اُبلتا ریزۂ جامِ فلک ہے دھوپ جاڑے کی،
چمکتی صبح — اور بستر میں ہو تم منجمد بیٹھے!!
کوئی الہامِ عشرت، کیا کوئی پیغامِ سرمستی،
تمھیں لکھا نظر آتا نہیں زرکار کرنوں میں۔؟
ادھر دیکھو — یہ ہے وہ رات جس نے کھُل کے قے کی تھی

اُسے پھر بھر کے لایا ہوں خداوندانِ نعمت سے
یہ نیلے نیلے کیا ہیں سات — اذنِ بادہ و نغمہ!!
نہ پوچھو داستاں — ممکن ہوا کیونکر حصول ان کا
بڑی محنت سے ملتے ہیں، ریا کے جال بچھتے ہیں
مری محبوبہ، میری دلربا، یعنی مری بیوی،
بہن کے بیاہ میں نذرانہ لیکر میکے جائے گی
بچائے تھے روپے کچھ اُس نے۔ انکو لیکر آیا ہوں
مگر میں بیس کی ساری کو ستّر کی بتاؤں گا
ہماری بیویاں بھی کتنی سیدھی سادی ہوتی ہیں
غریب انوارِ مشرق کی طرح پاکیزہ ہوتی ہیں
ادا، شوخی، شرارت اور ضد — فطرت ہے عورت کی
وہ عورت — لیکن ابد و ستِ ارضِ مغرب کا مقدّر ہے

اُٹھو جلدی کرو — میں اور بھی پروانے لاتا ہوں
اُنہیں پیغام دیتا ہوں کسی شمعِ فروزاں کا
ابھی لو — آئے سب کے سب سنوار رے اپنے پر پُرزے"

"بمل" کے جاتے ہی یاد آئے اُسکے پاؤں کے بندھن
بمل کا گھر — اُسے زرّیں قفس، اُجڑی جہاں کہہ لو
جہاں یہ ریت ہے — خرچ آٹھواں حصّہ ہو آمد ہو
جہاں دولت بہا کرتی ہے شادی پر، عمارت پر
مکاں دیکھو — تو اُس پر سے نگاہِ ناتواں پھسلے
مگر اندر غلاظت ہے، تعفّن ہے، کثافت ہے
گلے میں، باہوں میں پہنے ہوئے ہیں دیویاں گہنے
بدن پر اُنکے لیکن چیتھڑے ہیں — میل کے تودے

گیارہ سال کے، دس سال کے بچّے ہیں ننگے ہیں
یہاں معیارِ ہستی میں کوئی ہلچل نہیں ہوتی
یہاں جہدِ ترقّی ہے نہ رفعت کی تگ و دو ہے
یہاں اک کشمکش بڑھنا چلے میزان کھاتے کا
یہاں آسُودگی ہے اور وہ آسُودگی کیا ہے
مہینے میں دوائیں ساٹھ کی، ستّر کی آتی ہیں۔
مگر اک وقت کا پکّا ہؤا دو وقت کھاتے ہیں
یہاں پیاز ادرک بھی نہیں ہوتا ہے سبزی میں
روایاتِ مقدس سے یہاں کتنی عقیدت ہے
یہاں مذہب کی پابندی ہے کھانے اور پینے میں

بمل کی تیرہ بختی اور کیا اس کے سوا ہو گی

بچارے نے کثافت کے محل میں آنکھ کھولی ہے

ابھی چھ سال ہی کا تھا کہ اُس کی ماں وہاں پہنچی

کوئی رخصت سفر ہوتا نہیں ہے جس مسافت میں

گئی ماں — ہو گیا بند اوّلیں ایوانِ تربیت

بچارے کا ہوا خشک اوّلیں سرچشمۂ شفقت

جواں ماں آئی — اپنے ساتھ لائی ظلم کی کثرت

اثر ہے سانحۂ اندوہگیں کا آج بھی اُس پر

ہوا کرتی ہے موٹی، بھدّی عورت انتخاب اُس کا

جواں اور دُبلی عورت سے اُسے خوف اب بھی آتا ہے

بہل — بھولا بہل اس محبس زرّیں کا پروردہ

یہی دو سال گذرے اِس صنم خانے کا اک بت تھا

وہی عادت، وہی فطرت، وہی صورت، وہی ہیئت

وہی ناقابلِ برداشت سا اِک بوجھ کندھوں پر
دباؤ کی بدولت ہی بچارا پست قامت ہے
دباؤ کی وہ شدّت تھی کہ جب پہلے پہل اُس نے
مرے ساتھ ایک ہوٹل میں جوانی کو قریں پایا،
(جوانی کیسی — جو تھی فارغ التحصیل اداؤں میں)
چمک اُٹھّے تھے خفّت کے ستارے اُسکے ماتھے پر
نگاہیں جھک گئی تھیں، گڑ گئی تھیں اسکی — قدموں میں
دیئے روشن ہوئے تھے اسکے گالوں کے گلابوں میں
جوانی کو اُسے چھونے کی ہمّت ہی نہ پڑتی تھی،
عیاں تھی حسن پر ناپختگی اپنے شکاری کی
جوانی بھی ہزاروں دے چکی تھی درس عشرت کے
یہ قحبہ خانے — کتنی مستی جنسی درسگاہیں ہیں!!

بمل — باغی بمل ہے شدّتِ احساس کا گھائل،

نکلنا چاہتا ہے توڑ کر زرّیں قفس اپنا —

قدامت کا مگر جادو کبھی ٹوٹا ہے اِک پل میں؟

بغاوت کامراں ہوتی ہے کب پہلی ہی یورش میں

بمل تو آج بھی اپنے صنم خانے کا اک بُت ہے!!

وہی عادت، وہی فطرت، وہی صورت، وہی ہیئت

بھلا ممکن نہیں شاید کبھی انساں کی فطرت پر

بمل پر آج بھی غالب ہے حفظِ نفس کا ارماں

الگ ہی دوستوں سے اس کو دیکھا وقت پڑنے پر

بجا ہے — دوستوں کیساتھ مرنا عید ہوتی ہے

وہ ان اقوالِ زرّیں سے مسخّر ہو نہیں سکتا!!

وہ محض اس واسطے ساتھ آتا ہے یارانِ محفل کے

کہ تنہا عیش کی جرأت کبھی کر ہی نہیں سکتا،

نہ جانے زیست کیوں مرہونِ منّت ہے سہارے کی

مگر اک جام مے۔۔۔ اُبلا ہوا لاوا شجاعت کا

رگوں میں بھر ہی دیتا ہے بسمل کی۔۔۔ جوشِ بیخوفی

بسمل کو نشّے میں چاہو تو ٹکرا دو چٹانوں سے

جوانی بھی تو نشّہ ہے جنوں ہے آرزوؤں کا

یقیں ہے اتنا مجکو نشّے میں اک دن اگر بپھرا

بسمل اپنے صنم خانے کے حق میں غزنوی ہوگا

(۲)

"بڑی الجھن میں ہوں کتنے ہی مجکو کام کرنے تھے

مجھے سیلیوں کے ٹھیکے کے لئے افسر سے ملنا تھا

ابھی دینا ہے اس کی میم کو وسکی کی بوتل بھی

بڑی مشکل میں ہوں — رکتا ہوں تو ٹھیکہ نہیں ملتا

اگر جاتا ہوں مخلص دوست سب ناراض ہوتے ہیں

چلو چھوڑو — بمل پہنچا تو میں فوراً چلا آیا"

مجھے کلدیپ کی باتوں پہ آتی ہے ہنسی اکثر

کہ اُن میں نفسِ مضموں سے بڑی تمہید ہوتی ہے

ہمیشہ دُوسروں کے سر پہ وہ احسان رکھتا ہے

نہ جانے جو کوئی بھی دھوکا دیتا اور رکھتا ہے

ہمیشہ دوسروں کو عقل سے عاری سمجھتا ہے

بنا دیتی ہے اُس کو بھی خوشامد بیوقوف اکثر

خوشامد سے — جو چاہو کام تم کلدیپ سے لے لو

ذرا تعریف کر دو تم کسی ایسی ہی خوبی کی
نشاں تک بھی نہ ہو موجود جس کا اسکی فطرت میں
تمہارے راستے میں اپنی وہ آنکھیں بچھا دے گا
تصنّع جن میں ہوتا ہے تصنّع دوست ہوتے ہیں

"کہاں تھے رات کو؟" تم اُس سے اتنی بات اگر پوچھو
مقامی سیٹھ کی دعوت میں شرکت اُس نے کی ہوگی
جہاں اُس نے "بلیک اینڈ وائیٹ" اور "شمپین" پی ہوگی
جو اسٹیشن پر اس کو اتفاقاً دیکھ پاؤ گے
وہ دلّی جا رہا ہو گا کوئی ٹھیکہ بڑا لینے
کھڑا ہو گا اگر وہ دوسرے درجے میں گاڑی کے
تو شملے جا رہا ہو گا کسی محبوبہ سے ملنے

نہ جانے بات کیا ہے جس قدر محبوب ہیں اُس کے

کوئی کشمیر رہتا ہے، کوئی دِلّی کا باسی ہے

اگر آتے ہوئے رستے میں تم کلدیپ سے پوچھو

وہ اُٹھ کر آ رہا ہوگا کسی افسر کے دفتر سے

اگر جاتے ہوئے رستے میں تم کلدیپ کو روکو

وہ گھر سے جا رہا ہوگا کسی افسر سے ملنے کو

بچارا اس قدر مرعوب ہے، عہدوں سے منصب سے

کہ اُس کی گفتگو کا ارتقا افسر ہی ہوتے ہیں

پریزادوں سے کی ہیں اُس نے جن کی خلوتیں روشن

ہے عورت — مرد کی سب سے بڑی دلچسپ کمزوری

"پرتو" — یاد ہے چہرہ مجھے مظلوم لڑکی کا

گھنی زلفیں۔ گھنے ابرو، حسیں ماتھا، حسیں شانے
اُسی نے جگمگائیں افسروں کی ملگجی راتیں
ثمر کلدیپ کو ملتا تھا لیکن اُس کی محنت کا
ہمیشہ دوسرے ہی مزدو محنت کا ہیں پھل کھاتے

کسی پر کمتری کا رنگ اُتنا بھی نہ گہرا ہو
مجھے بھولا نہیں ہے اک درخشاں رات کا قصّہ
وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا امرتسر سے اک لڑکی
اُسے جس نے بتایا تھا کہ وہ کوٹھی میں رہتا ہے
بچاری نے مگر وہ رات قبرستاں میں کاٹی تھی
وہ کہتی ہی رہی اُس سے مجھے گھر لے چلو اپنے
اُسے گھر کیسے لے آتا۔ مزا آتا جو لے آتا،

بچارا ننگا ہو جاتا — حقیقت سامنے آتی —

ملمع جو چڑھا رکھا ہے اُس نے اپنے چہرے پر
اگر اک دن وہ ہمّت آشنا ہو کر اُسے دھو دے
اگر وہ خود کو ننگا دیکھنے کا حوصلہ کر لے
تو کلدیپ اور بھی مقبول ہو سکتا ہے نظروں میں

(۳)

"کہو کیسے ہو، چپ بیٹھے ہو، اچھے تو ہو تم دونوں؟
ابھی اخبار میں پڑھ کر ہٹا ہی تھا — کمل پہنچا،
بڑا خوش تھا — کہیں دیکھا ہے کوئی جلوۂ رنگیں
ادھر اتنے دنوں سے زندگی بے کیف، افسردہ
گذرتی تھی — یہ مژدہ دعوتِ کوثر سے کیا کم ہے"

"اِنل دت" کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا
مواقع جب میسّر ہوں تو پھر وہ رائیگاں کیوں ہوں
اِنل دت جانتا ہے اپنے ہر ہر سانس کی قیمت
چھڑک لیتا ہے وہ بے رنگ لمحوں بھی خوشبوئیں
"مرادیں حسب نیّت ملتی ہیں" — یہ سنتے آئے ہیں
مثل — تنہا اِنل دت پر ہی لیکن صادق آتی ہے
کہ اُس کی شہر میں ہے موٹے بنیوں سے شناسائی،
ہوا کرتے ہیں موٹے استوار اقدام سے عاری
بہت آساں ہے دھارے موڑ دینا اُنکی فطرت کے
اِنل دت کے وہ آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں
اِنل دت کے خیال — اشلوک ہو جاتے ہیں گیتا کے
اِنل دت کے بغیر — اُنکی کوئی تقریب عشرت کی

فروزاں ہو نہیں سکتی، درخشاں ہو نہیں سکتی

انل دت کی لذیذ اور گرم باتیں مول بکتی ہیں

ہزاروں ایسے بھی انسان اس دنیا میں بستے ہیں

نہ جن کے راستے کوئی نہ جن کی منزلیں کوئی

ضرورت ہر قدم پر راہبر کی جن کو پڑتی ہے

انل دت ایسے ہی گمراہ انسانوں کا رہبر ہے

کوئی کشمیر جائے یا کوئی دلّی کا عازم ہو

انل دت اُس کے ہی مصرف پر اُسکے ساتھ جائیگا

انل دت اپنے ہر خط میں یہ پہلی سطر لکھتا ہے

"میں انبالے میں جگ کے ساتھ ہوں پنجاب ہوٹل میں"

"کراچی سے میں لکھتا ہوں تمہیں کشمیر ہوٹل سے

مرے ساتھ آئے ہیں لالہ ہزاری لعل سوداگر"

مجھے رشک آتا ہے اکثر انل دت کے مقدر پر
مجھے وہ دن نہیں بھولا وہ لمحے یاد ہیں مجھکو
جب آیا تھا وہ میرے پاس آنکھوں میں چمک لیکر
"چلو گے ۔۔۔ جا رہا ہوں اگلے ہفتے میں "دنیا" کو
"کروڑی مل مجھے لیجا رہے ہیں ۔۔۔ تم تو واقف ہو
خدا حافظ ۔۔۔ چلوں ۔۔۔ اک سال کے بعد آ کے مل لونگا"
وہ باتیں کر رہا تھا اور میرے دل میں نشتر تھے
وہ اپنے ساتھ لایا تھا حسیں مغرب کے افسانے
فسانے حسن کے، رنگینیوں کے، عیش زاروں کے
وہ افسانے سناتا اور ہم اِس سوچ میں رہتے
انل دت آدمِ ثانی ہے ۔۔۔ اور جنّت سے آیا ہے

انل دت سوچتا رہتا ہوں مَیں خوش بخت ہے کتنا
یہی جاڑے کے دن تھے۔ برف کا طوفان برپا تھا
جہاں بھی ہم گئے اور جاکے دروازوں پہ دستک دی
کھڑے پایا وہیں مایوسیوں کو نامرادی کو۔
انل دت کے مگر کہنے سے اک ہوٹل میں جا بیٹھے
وہاں بھی کھیلتی تھی برف زاروں کی سی ویرانی
نہ غنچے تھے، نہ کلیاں تھیں، نہ زلفیں تھیں نہ ساغر تھے
مگر ہوٹل کا مالک نوشگفتہ ایک غنچہ تھا
انل دت نے اُسے دیکھا نگاہوں سے اُسے پرکھا
نہ جانے اُس سے کیا باتیں ہوئیں اور کیا کہا اُس کو
ہمارے سامنے کی بات ہے دو تین لمحوں میں،
انل دت اس کو پہلو میں لئے تھا۔ مسکراتا تھا۔

انل دت کے بہت سے شوق ہیں اُن میں سے اک یہ ہے

کیا کرتا ہے اپنی دوسروں پہ برتری وارد

تمہیں وہ گھر بُلائے گا ـــــ تمہیں چائے پلائے گا،

مراد اُس کی مگر اُس سے تواضع تو نہیں ہوتی

تمہیں چائے پلاتا ہے کہ تم مرعوب ہو جاؤ

نفاست سے حسیں ٹی سیٹ سے بیٹھک کے تکلف سے

انل دت اب بھی یوں بیٹھا ہے میرے سامنے جیسے

فلک پر ہو مقام اُس کا، زمیں پر سجدہ سا ہوں میں

(۴)

ہمل کے حکم سے تھیلے میں پریاں بھر کے لایا ہوں۔

ابھی تھیلے میں ہیں ـــــ جی چاہتا ہے شعر کہنے کو

سنو میں دیکھ کر آیا ہوں رستے میں وہ نظارا

ابھی تک میری آنکھوں میں جو رقصاں ہے درخشاں ہے

بڑے برگد کی لمبی لمبی داڑھی کے اندھیرے میں

کھڑا اٹھالے کے خالد اپنا "پاشس مارکہ" دلبر

چھپا رکھا تھا چہرہ اُس نے یوں آغوش میں اسکی

کہ جیسے بچہ کھیلے گود میں اک جشن آیا کی

نہ جانے یہ مقولہ یہ مثل سچی کہاں تک ہے

"محبت خوبصورت خوبرو اشیاء سے ممکن ہے"

کبھی دیکھا ہے گھلتے ملتے اِک گورے کو کالے سے

جو سچ پوچھو تو خالد۔ ہے مبارکباد کے قابل

طلسمِ رنگ جس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دکھایا ہے"

یقیناً نیجمن سے مل کے بیحد آپ خوش ہوں گے

تضاد اُس کی طبیعت کا یہی کردار ہے اُس کا

حقیقت میں مرکب ہے وہ سونے اور پیتل کا

بڑا ہی زود فطرت، زود رنج اور زود مقصد ہے

وہ بادل ہے جو چھاتا ہے گرجتا ہے، برستا ہے

بہا دیتا ہے، بہہ جاتا ہے وہ ایسا تلاطم ہے

وہ رُکنے کا، ٹھہرنے کا نہیں قائل رواں ہو کر

"وہ رُکنے کا ٹھہرنے کا نہیں قائل رواں ہو کر"

اُسے کہہ دو۔ کہ ہو گا آج شغلِ بادہ و شاہد

کہیں سے لائے خالی جیب اپنی بھر کے لائے گا

مقامِ وعدہ پر احباب سے پہلے ہی آئے گا

لبِ ساغر جو چھو جائے گا اک بار اُس کے ہونٹوں سے

وہ مدہوشی کی، بدمستی کی حد تک پی کے اُٹھے گا

بڑا ہی زود فطرت زود رنج اور زود مقصد ہے

وہ جب بھی نشےّ میں ہوگا، ہنسے گا مسکرائے گا

وہ گرد وپیش دیکھے گا، یہی اُس وقت چاہے گا

کہ کر دے دوستوں میں سے کوئی گانے کی فرمائش

کھڑا ہو جائے گا — مخصوص لَے میں گیت گائے گا

غزل ہو، گیت ہو، ٹھمری ہو، اِک ہی لَے میں گاتا ہے

نہ جانے اس قدر وہ گیت کیوں مرغوب ہے اِس کو

کہ ہے پنجاب کے دیہات کا دل جس کی تانوں میں

وہ جس میں ہوٹی اور اک پتلی دوشیزہ کا قصّہ ہے

جھکے گا، مسکرائے گا، نظر سے داد چاہے گا

ابھی بیٹھے گا — گا کر جانے کیا یاد آئے گا اس کو

وہ رونے لگ پڑیگا، ہچکیاں بندھ جائینگی اُس کی

غلط ہے جامِ مے میں "خود فراموشی" کا جادو ہے

ہر ایک انسان غمگیں، غم زدہ، غم دوست ہے کتنا
ذرا سی ٹھیس سے دُکھوں کے سوتے پھوٹ بہتے ہیں
نہ جانے کونسا غم ہے جو اُس کے قلبِ مضطر میں
ہُوا ہے جا گزیں جاوید بن کر، جاوداں ہو کر
سبب پوچھو گے اُس سے تو یہی ہو گا جواب اس کا
کہ اُس کے دوستوں کو اُس سے منہ دیکھے کی اُلفت ہے
محبّت بھی طلبگارِ محبّت ہے حقیقت میں

وہ بادل ہے جو چھاتا ہے، گرجتا ہے، برستا ہے
فریب اور بنجمن کہا جائے — دشوار اور ناممکن
بڑا ہی ماہرِ فن ہے وہ عورت کے خصائل کا
کیا کرتا ہے حسبِ حال حیرت خیز اداکاری

"چمیلی" پتلی پتلی، دُبلی دُبلی یا دُ ہے بلّی —!!

جسے لطف آتا تھا غمزوں سے مردوں کے بنانے میں

اداؤں ہی سے جن کی بھوک، کی تسکین کر دیتی

خبر کیا تھی اُسے آج اس کا جو مدِّ مقابل ہے

بڑا ہی فتنہ گر، فتنہ ادا اور فتنہ ساماں ہے

بچاری سے نہ جب کچھ بن پڑا تو رو پڑی آخر

وہ جتنا چیخی، پیٹی، بنجمن اُتنا ہی چلّایا،

ریاکاری سے تنگ آ کر بچاری نے سپر ڈالی

وہ ہنستے مسکراتے دونوں پھر نکلے تھے کمرے سے

(۵)

"مجھے حیرت ہے قدرِ وقت سے بیگانہ سب کیوں ہیں۔

مثل ہے۔ "وقت ہی دولت ہے" انکو لاکھ سمجھاؤ

مگر — وقتِ معیّن پر کبھی گھر سے نہ آئیں گے

ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے ہمیشہ انتظار اُن کا"

سعید — اور اس کا چہرہ اُسکی یہ معصوم جھنجلاہٹ!!

کوئی تندی — کوئی غصّے کی چنگاری نہیں رکھتی

سکوں ہی — اُس نے سیکھا ہے حوادث کے تھپیڑوں سے

مگر اُس کی حیات — اِک رزم ہے جنگِ مسلسل ہے

ہمارے گھر — یہ اینٹوں، لکڑیوں کی چار دیواریں

نہیں! جو غور سے دیکھو تو چھوٹی سی، ریاست ہیں

جہاں فرمانرواؤں سے ہیں اطوار اپنے آبا کے

جہاں کوئی نہیں تفریق اولاد اور پرجا میں،

وہی ہیبت، وہی تندی، وہی حکمت، وہی سختی،

سمجھتے ہیں جہاں بچّوں کو اپنے جائداد اپنی

وہ جن کا حسب منشا خوب استعمال ہوتا ہے

جہاں کی جاتی ہیں سلب انفرادی قوتیں جن کی

جہاں معمار کی اولاد بھی معمار ہوتی ہے

جسے احساس اپنی انفرادیّت کا ہوتا ہے

یہاں الزام عائد اُس پہ ہوتا ہے بغاوت کا

یہاں مسدود ہو جاتے ہیں در اُس پر اعانت کے

حکومت میں بغاوت کی سزا بھی سخت ملتی ہے

جو اپنی انفرادیّت سے کر لیتے ہیں غدّاری،

یہاں ملتا ہے ان کو جانفزا منصب سعادت کا

حکومت بانٹتی ہے جیسے غدّاروں میں نذرانے۔

کچل دینا سعید اپنی جو روحِ انفرادیّت

نہ اُتنا غمزدہ ہوتا، نہ اِتنا مضمحل ہوتا

نہ اُس کے راستے کا رخنہ بنتے اُسکے گھر والے

مگر یہ بات الگ ہے مَردِ نے لڑنا ہی سکھا ہے

سعید اسکی حیات اک جنگ ہے رزمِ مسلسل ہے

تمنّاؤں کا اپنی خون ہوتے اُس نے دیکھا ہے

کڑی تنہائیوں میں دل کو روتے اُس نے دیکھا ہے

میں اکثر سوچتا ہوں ایسے خستہ حال انساں کو

بنایا کیوں نہیں ہے سنگدل زورِ حوادث نے

نہ جانے آج بھی وہ موم کیوں ہے نرم دل کیوں ہے

اُسے پگھلا دیا ہے اُلفتِ ناکام نے شاید!!

یہ اُس کی بدنصیبی میں بھی ظالم ہاتھ پنہاں ہے

گھروں کی سلطنت کے پُر رعونت بادشاہوں کا

محبّت کا مزا چکھ کر بھُلا دینا نہیں آساں

وہ پھر بھی اس کو چکھتا ہے جو لذّت یاب ہوتا ہے

وہ اِک مشکل سے نکلا تھا ــــ نئی مشکل نے آ گھیرا

وہ تصویر ــــ ایکٹرس کی دیکھتے ہی دل لٹا بیٹھا

بچارا بن گیا موہوم افسانوں کا شہزادہ

جنہیں پاگل بنا دیتی تھیں تصویریں مصوّر کی ــــ

رہا آوارہ سر وہ بمبئی کی صاف سڑکوں پر

تڑپتا ہی رہا اور گوہرِ مقصد نہ ہاتھ آیا،

تمنّاؤں میں بھر دیتی ہے دائم آگ، محرومی

جبھی تو معتقد سچی فلاطونی محبّت کا

بنایا ہے اُسے ناکامرانی، نامرادی نے
اب اکثر کامیابی، کامرانی کی تمنّا میں
بدلتے رہتے ہیں آدرش اُس کے مستقل جامد
پڑا کرتے ہیں دَورے آج بھی اُس پر محبّت کے

حمیدہ — اِک طلائی دانت تھا جس کی تبسّم میں
جسے رہ رہ کے ہنس ہنس کر نمایاں کرتی رہتی تھی
بڑی خوش وضع تھی خوش پوش تھی اور خوش طبیعت تھی
مگر لبریز تھا دل اس کا آلام و مصائب سے
میاں کی اپنے وہ بیوی کہاں تھی اسکی روزی تھی
وہ اپنی سخت گیری سے ڈراتا تھا بچاری کو
مگر ظلم اپنے محکوموں پہ قبضہ رکھ نہیں سکتا

وہ آخر بھاگ نکلی تانگے والے کی معیّت میں
لگائی اپنے دِل پر اُس نے مرہم خود فریبی کی
سمجھتی تھی کہ کر لی ظلم سے حاصل نجات اُس نے
وہ تانگے والا اُس کا پہلا شوہر تھا خصائل میں
تطابق کس قدر ہے حکمرانوں کے مزاجوں میں
سعید۔ اِس غمزدہ لڑکی سے کتنا پیار کرتا تھا۔
مثل ہے۔ "وقت ہی دولت ہے" اُس کا معتقد، قائل
حمیدہ کو بٹھا کر سامنے دن کاٹ دیتا تھا ــــــ
وہ جب بھاگی تھی عالم تھا بچارے پر قیامت کا
مصیبت اور رسوائی کا ذلّت تھا فرار اُس کا
چھپا رکھا ہے ہم نے اسکو ــ شک گذرا تھا یہ سب کو
محبّت بیسوا کی بھی ہے عصمت باختہ اُلفت ــ

رضیہ — صاف ستھرا، رنگ مست آنکھیں، گھنے ابرو

سعید اُس سے ملا تو دل گنوا بیٹھا پکار اُٹھا

"جمال اس کا مرا آدرش ہے، معیار ہے میرا"

کٹی جب رات آنکھوں میں — نہ وہ وعدہ شکن آئی

سعید اُٹھا بہت مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹا،

کئی ہفتے حجامت تک نہ بنوائی بچارے نے

سعید — اس کے بھٹکتے عشق کا یہ چوتھا دورہ تھا

وہ بھاری جسم کی کملا — سلونی سانولی کملا!!

نہ جانے بات کیا اُس میں تھی — میں حیراں ہوں ششدر ہوں

نہ جانے اتری کیوں اُس کے بلند آدرش پر پوری

گماں یہ ہے بلند آدرش ہی اُس تک — اُتر آیا

نہ بھولے گی ہمیں اُس دن کی اسکی گریہ وزاری

کہ وہ ہنستی تھی اور یہ خون کے آنسو گراتا تھا

سعیدؔ اُس کے یہ پیار سے عشق کا تھا پانچواں دورہ

محبت میں مسلسل نامرادی کی یہ ارزانی ——!!

سبب بنتی چلی جاتی ہے اس کی کوچہ گردی کا

ہر اِک، دیکر طرب کا، عیش کا، تفریح کا جھانسہ

جہاں چاہے اُسے لیجاتا ہے وادی میں، پربت پر

کوئی اتنا بھی محرومِ مسرّت ہو نہ عالم میں

تصوّر کا جو منّت کش ہو کیف و رنگ کی خاطر

وہ خود کو مست کر لیتا ہے ساغر کے تصوّر سے

وہ سگرٹ پی کے بھی مخمور ہو جاتا ہے پل بھر میں

یہ اُس کی تشنگی جانگاہ —— لامحدود بے پایاں

شکستوں سے اُسے ہونے نہیں دیتی سراسیمہ

اُمید اس کو ہے اب بھی سیرِ چشمیٔ تمنّا کی۔

سبب شاید یہی ہے وہ کفایت دوست ہے اتنا

اسی اُمید پر شاید اسی تنہا بھروسے پر

کہ اک دن اُس کا آدرش آ گرے گا اُس کے دامن میں

وہ دولت بھی بچاتا ہے، وہ قوّت بھی بچاتا ہے

کہ اک دن کام آئے گی کفایت اور پس اندازی

وہ میرے سامنے بیٹھا ہُوا غرقِ تصوّر ہے۔

نظر ہے اس کی شاید مرغزاروں پر بہاروں پر

وہ شاید دیکھتا ہے خواب "ہالی وڈ" کی جنّت کا

فرانسسکو کا، پیرس کی طرب گاہوں کا، لندن کا

یقیں ہے اس کو مغرب ہی میں بر آئیں گی اُمّیدیں

یہ اس کی آخری اُمّید اس کی زندگانی ہے

(۶)

"بہت ہی سست بیٹھا تھا کہ اتنے میں ملِک پہنچا

جب اُس نے یہ کہا۔۔ دو وائٹ لیبل ہاتھ آئی ہیں"

نہ پوچھو دل پہ کیا بیتی، مری نظروں پہ کیا گذری

دکھاؤ تو کہاں ہیں ـــــ ان کو سینے سے لگاؤں گا

غضب ہے، رنگ کیا ہے دیکھنے سے نشّہ ہوتا ہے

انہیں کونے میں رکھتا ہوں کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے

بتاؤں آجکل غفّار کیوں شامل نہیں ہوتا،

ہُوا ہوں راہ میں آتے ہوئے اس پہ از سرِنو تُف

نہ پوچھ آج اُس کے ساتھ کیسا برف پارہ تھا

وہ لڑکا تھا — کہ بجلی تھا، چھلاوہ تھا، شرارہ تھا،

کہاں سے جانے لے آتا ہے آئے دن نیا جلوہ

اگر بھولے سے کہہ بیٹھو تم اُس سے "یہ بھی کیا لت ہے"

وہ پھر گنوائے گا اتنے فوائد اس بُری لت کے،

کہ تم کو ہر طرح سے اس کا قائل کر کے چھوڑے گا

کہے گا — "سب سے پہلے تم پہ کوئی شک نہیں کرتا

"ہمارے بیٹے کا دوست آیا ہے" گھر والے کہتے ہیں

اُسے چائے پلاتے ہیں، اُسے بسکٹ کھلاتے ہیں

پھر اس کو جس جگہ جی چاہے اپنے ساتھ لے جاؤ

کہو کیا داشتہ کو اپنی رکھ سکتے ہو ساتھ اپنے — ؟"

بھئی کچھ بھی ہو بے معنی نہیں غفّار کی باتیں

مگر لڑکوں کے غمزے سہنا، اِن سے دوستی رکھنا

ہے بالکل ایسے، جیسے بھینس گھر میں باندھ لے کوئی

میں سچ کہتا ہوں، ہم سے یہ محبّت نبھ نہیں سکتی"

حنیف — اسکی بھی فطرت سینکڑوں رنگوں کا آنچل ہے"

وہ جس میں کچھ سیاہی کی لکیریں ہی نمایاں ہیں

کئی ماحول ہیں — گذری ہے جن سے زندگی اسکی

ابھی تک اُس پہ ہیں چھائے ہوئے سائے یتیمی کے

ابھی تک بھوک سے نالاں ہیں اُسکے پیٹ کی آنتیں

ابھی تک پیاس کے باقی ہیں اُس کے حلق میں کانٹے

ریاکارانہ اگر ہے اسکی فطرت میں وہ بے بس ہے

فلاکت ملگجے کردار ہی تعمیر کرتی ہے۔

بناوٹ ہے، شرارت ہے، تصنّع ہے، نمائش ہے
یہی تو ارتقائی دَور کے حاصل ــــــ محاسن ہیں
حنیف انکی بدولت دیکھتا ہے اپنے قدموں پر
مسرّت، فتح و نصرت، کامرانی، شوکت و عظمت
مسرت چند لمحوں کی سہی، آخر مسرّت ہے
طرب سا مانیوں پر اختیارِ عارضی اس کا
اُسے سرشار کچھ دن کیلئے تو کر ہی دیتا ہے
حقیقت میں ریاکاری بھی فن کاری کی حامل ہے
حنیف اوصاف دشمن ہی نہیں ہے ماہرِ فن ہے
ہر اک محبوبہ جس کی ہمدمی کا فخر ہے اس کو
کبھی آغاز میں اس کی بہن تھی اس کی ہمشیرہ
بہن کے لفظ میں کتنا تقدّس ہے کہ بے کھٹکے

ہر اک دوشیزہ کے تم بھائی بن سکتے ہو — پھر شوہر

ہنسی آتی ہے مجکو آج "گرٹی" کی حماقت پر

حنیف اُس کا بھی بھائی تھا بڑی خوش تھی بہن بن کر

اسی بھائی کا بچّہ بن چکا ہے گود کی زینت

اب اس مضمون کے خط لکھتی ہے ۔ اپنے پیارے بھائی کو

"لگائے رہتی ہوں سینے سے میں تیری نشانی کو"

بتاؤں — عورتیں کیوں چاہتی ہیں جعلسازوں کو ؟

کہ جھوٹے حسن کے بہتر ملمّع ساز ہوتے ہیں

حنیف اس کے گھٹا سے رنگ کو انجیر کہتا تھا

اُسے انجیر جب کہتا تو "گرٹی" کھلکھلا پڑتی

ذرا سی تمکنت آجاتی بھدّی چال میں اس کی

فریدہ بھی تو اُس کے گھر میں آئی تھی بہن بن کر

بڑی ظالم ہوا کرتی ہے کالی رات ساون کی

رگوں میں جلتا جلتا تیز نشّہ گھول دیتی ہے

یہ راتیں ہیں کہ قدرت کا اجازت نامۂ عشرت!!

اسی ظلمت میں دوشیزہ کو عورت بننا پڑتا ہے

اسی پردے میں بعض اوقات بنتی ہے بہن بیوی

حنیف اپنی پریشاں حال، اپنی نیک بیوی کو

زیادہ دیر تک کس طرح کیوں کر مطمئن رکھتا

کہ راز افشا ہی ہونے کیلئے ہوتے ہیں عالم میں

حنیف اس نے اٹھا کر ہاتھ پر قرآں قسم کھائی:

"فریدہ کا میں بھائی ہوں۔ فریدہ ہے بہن میری"

حنیف اوصاف دشمن ہی نہیں فن کا بھی ماہر ہے

اُسے معلوم ہے مذہب کے جادو کی ہمہ گیری

کوئی جھوٹی قسم کھا کر فنا تو ہو نہیں جاتا
قسم — اور اس کی بیوی ہو گئی تھی مطمئن کتنی
بچاری کا یہ اطمینان بے چاری کو لے ڈوبا
اب اک کونے میں بیٹھی رات دن قسمت کو روتی ہے

حنیف اسکی بھی فطرت سینکڑوں رنگوں کا آنچل ہے
غرور اتنا — معافی تک نہ مانگے گا حماقت پر
مجھے اک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ لکھ ہی دیتا ہوں
وہ ننھّی بلبسوا، وہ شانتی جو گھر سے نکلی تھی
ارادہ باندھ کر اک لاکھ سکّے جمع کرنے کا
اُسے اپنے شباب و حسن پر ایقان تھا کتنا
عجیب اسکی طبیعت تھی، عجیب اسکی بھی خواہش تھی

وہ کوٹھی چاہتی تھی ــــ باغ اور موٹر کی طالب تھی

تجارت کیسی ہو آخر امارت اس کا مقصد ہے

حنیف اس زر پرست اُس تاجرِ خوش رنگ کی خاطر

وفا خو ــــ ہمدمِ دیرینہ سے دست و گریباں تھا

وہ تسلیم آج کے دن بھی نہیں کرتا قصور اپنا

قریب اتنا ــــ کہ جس سے ربط اپنا وہ بڑھائے گا

کئی اُمیدیں اس کی ذات سے وابستہ کر لے گا

اُسی کا کھائے گا ہر دم اُسی کے گیت گائے گا

ذرا سی بات پر اُس سے بگڑ بیٹھے تو فوراً ہی

اُسے پاگل بتائے گا، اُسے بدّھو بنائے گا

"بھئی رحمٰن!۔ ارے اس کو تو میں اُلّو بناتا تھا"

اِسی جھوٹی رعونت سے وہ خِفّت کو چھپائے گا

نمائش اِس قدر گھر سے پہن آئے گا جو کپڑا —

بھرے بازار میں ملنا محال اُس کا ہے مشکل ہے

وہ جس سے لایا تھا اُس کی دکاں میں تین ہی گز تھا

وہ میرے سامنے بیٹھا ہُوا ہے اس نزاکت سے

کہ جیسے وہ ابھی اُٹھّے گا اور یہ راز کھولے گا

کہ جس کرسی پہ وہ بیٹھا رہا تختِ سلیماں تھی

(۷)

"کریم اللہ سے باتیں کر رہا تھا جب کمل پہنچا۔

کریم اللہ نے کل جس زرد رُو درزی کو پیٹا تھا

سنا ہے اسکی حالت صبح سے ابتر ہے نازک ہے

غلط کیوں جانے ہر طاقت کا استعمال ہوتا ہے!!

زبردستی — بنا دیتی ہے ناممکن کو بھی ممکن —

سلیمہ بھی تو حاصل اُس نے کی ہے زورِ بازو سے

نہیں تو بات کیا اُس میں ہے — ٹھنگنا قد، سیہ رنگت

قویٰ جاہل، جری منگول کی تصویر ہے گویا

یہ تصویر اور چڑھ سکتی بھی ہے عورت کی نظروں پر؟

مَیں خود حیراں تھا — اِک دن پوچھ ہی بیٹھا سلیمہ سے

ابھی تک گونجتا ہے میرے کانوں میں جواب اس کا

"میں کیا کرتی — میں جب دفتر سے آتی سامنے ہوتا

مَیں جب دفتر کو جاتی — روک لیتا راستہ میرا

مجھے تنگ آ کے جھکنا ہی پڑا — مجبور ہے عورت!!

کروں کیا — میں کہاں جاؤں — مَیں پابندِ سلاسل ہوں"

ہزیمت خوردہ دشمن کو بھی کوئی چھوڑ دیتا ہے

مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ عورت خوش بھی اُس سے ہے

جو اس کو پیٹے، اِس پر ظلم کے کوہِ گراں توڑے

کہ عورت فطرتاً ہوتی ہے ظلم و جور کی خوگر

مگر یہ کیا — ابھی سے ہی بہکنے لگ گیا ہوں میں

یہاں تو فلسفے کو غرقِ بادہ کرنے آیا ہوں"

جگت سنگھ — یوں تو جذباتی ہے لیکن ایسا جذباتی

وہ جس کا دل ہوا کرتا ہے جھلمل جھلمل آئینہ !!

کہ جس پر بال پڑنے کا نہیں ہوتا ہے اندیشہ

ہر اک تصویر لیکن دو رخی ہوتی ہے — یہ سچ ہے

وہ جب پی لیتا ہے جی چاہتا ہے اس کا لڑنے کو

صفت اپنی نہیں یہ اُس کی — شاید تندمے کی ہے

مگر لڑتا نہیں ہے — ہر کوئی گلرنگ مے پی کر
شرابِ ارغوانی کے تاثر کی بہ نیرنگی —!!
کوئی رو پڑتا ہے —— اور کوئی باتوں سے نہیں تھکتا
کوئی سوچا تا ہے —— اور کوئی جھگڑا مول لیتا ہے
جگت سنگھ پر بھی طاری ہیں یہی کیفیتیں چاروں۔
جگت سنگھ اُس کی داڑھی بھی ہے اک تصویر دو رُخ کی
سفید اور کالی داڑھی جس کو باندھے رکھتا ہے ہر دم
وہ جس سے اُس کے چہرے پہ ہے عالم دھوپ چھاؤں کا
وہ جس کے نیچے آدھے گال ٹھوڑی ہونٹ پنہاں ہیں۔
نظر آتی تو ہے اکثر اذیت دہ عذاب اس کو
گذر آیا ہے لیکن سرکشی کے دَور سے کوسوں
وہ جب یہ مستقل جامد روایت توڑ سکتا تھا

بچارا کیا کرے اب موردِ تشنیع ہوتا ہے

وہ "بلونت" اب بھی آجاتی ہے جو بزعمِ تصوّر میں
بڑی چنچل تھی، ہنس مکھ تھی، بڑی ہی شوخ فطرت تھی
عجب اُس کی طبیعت تھی، انوکھا تھا مزاج اس کا
اُسے اپنی تجارت کا سلیقہ بھی نہ آتا تھا
کہ اُس کا شوق تفریحی تھا، لذّت کوش تھا شاید
"پتا جی، پاؤں پڑتی ہوں" جگت سنگھ سے وہ جب کہتی
جب اُس کی گود میں گر کر وہ داڑھی کو ہلا دیتی
نظر آتیں اُسے داڑھی پہ چلتی قینچیاں لاکھوں

جگت سنگھ اب بھی یوں بیٹھا ہے جیسے سوچتا ہوگا
اگر وہ بیاہ سے پہلے ذرا سا حوصلہ کرتا

تو اس کے سر پہ ترچھی ہیٹ پگڑی کی جگہ ہوتی

"وہ آتا ہے بمل اُٹھو چلو یہ اونگھنا چھوڑو۔
اُٹھو چلنے سے پہلے دل ہی دل میں یہ دُعا مانگو
کہ جیسے ہم ہیں ہنستے کھیلتے رنگین پروانے
ملے ویسی ہی ہنستی بولتی شمعِ فروزاں بھی"

ادب لطیف افسانہ نمبر ۴۵ء

۱۲ر جولائی سے ۱۰ر ستمبر ۴۵ء

ہری کا گھر

مفلسی کی زندگی ہے بے کسی کی زندگی
آدمیّت سے ہے خالی آدمی کی زندگی

بخت ہے سویا ہوا تقدیر ہے پھوٹی ہوئی
حوصلے مفلوج، ہمّت کی کمر ٹوٹی ہوئی

مبتلائے مفلسی فاقہ کشی سے ہیں نڈھال
مضمحل چہرے پریشاں حال، ژولیدہ خیال

کُرتے کا دامن گریباں کے لئے آغوش ہے
پاؤں سے ہر وقت چسپاں میل کی پاپوش ہے

ہے خمیدہ چھت مکاں کی جابجا ٹپکی ہوئی

نیم باز آنکھیں کسی کی جس طرح جھپکی ہوئی

اِس طرح بھاگے ہوئے چوہوں کے بِل ہیں جا بجا

جس طرح ہوں ریت کے میدان میں گہرے خلا

چند مہمل سی لکیریں زینتِ دیوار ہیں

اور کچھ صندوق جن کے قفل تک بیکار ہیں

گرمیٔ بازارِ غم ہے اور چولھے سرد ہیں

ننھے ننھے، فاقہ کش بچوں کے چہرے زرد ہیں

بے سروسامانیاں ہیں اور سرو کارِ حیات

چادرِ ظلمت میں ہیں ملفوف انوارِ حیات

یہ وہ دُنیا ہے کہ جس میں انقلاب آتا نہیں

گردشیں آتی ہیں دورِ کامیاب آتا نہیں

"عالمگیر" اگست ۱۹۴۲ء — ۲۸ جنوری ۳۹ء

کم نگاہی

مڑ کے دیکھتا ہوں میں

زندگی کی رزمگاہ، سرد اور بجھی ہوئی

جیسے ایک بیسوا رات کی تھکی ہوئی

ہو پلنگ پر اداس نیم جاں پڑی ہوئی

کوئی کشمکش نہیں، کوئی جستجو نہیں

اب تو دور دور تک حشرِ ہاؤ ہو نہیں

چار سُو نگاہ میں سُوکھے جسم ہیں

موت کی جبیں پہ ہیں یا کہ یہ تیوریاں —

چار سُو نگاہ ہیں — ہڈیوں کے ڈھیر ہیں

آج بھی جھلکتے ہیں جن سے بھُوک کے نشاں

زندگی گراں رہی موت رائیگاں گئی

سیر ہو کے جا رہے ہیں گدھوں کے کارواں

میرے ہم سفر تمام سادگی شعار تھے

رنج کے شکار تھے، غم سے دلفگار تھے

پھر بھی مطمئن جئے — کتنے وضعدار تھے

وہ پڑی ہے ناظمہ، وہ مری رفیق کار

وہ مری شریکِ غم، زیست کی شگفتگی

سچ کہ غمزدہ رہی فاقہ کش رہی مگر

بھیڑیوں کے واسطے تر نوالہ ہی رہی

اس کا جسم ڈھانپ دوں کیونکہ ہے برہنگی

اِس فریبِ زار میں ناپسند کی گئی

حالتِ ستم نصیب دیکھتا نہیں کوئی

کیوں ہوا کوئی غریب دیکھتا نہیں کوئی

اور — حقائقِ مہیب دیکھتا نہیں کوئی

باغ دیکھتے ہیں سب، راغ دیکھتے نہیں

چاند دیکھتے ہیں سب داغ دیکھتے نہیں

٭ ادبِ لطیف "جولائی ۴۴ء

۲۳ فروری ۴۴ء

موازنہ

جھونپڑے ۔ جھونپڑے ہر سمت غلیظ اور گندے
جن سے اُٹھتا ہے دھواں دن میں بمشکل اک بار
جھونپڑے ہیں کہ کڑی بھوک کے ہیں محشر زار
اِن میں آباد ہیں کنگال خدا کے بندے!!
جن کے اعصاب پہ طاری ہیں بکھیڑے دھندے
جھونپڑے ۔۔ جھونپڑے ہر سمت غلیظ اور کثیف
اِن میں شیطان گر اس قدر رہتے ہیں اَن پڑھ جاہل
پست قد، منحنی، مجبور، غلام اور گھائل ۔

بھُوک کا مارا ہُوا، غم سے نڈھال اور نحیف

اِک گُنہ کی بھی جسے تاب نہیں اتنا ضعیف

اپنی راتوں کو سیہ کار نہیں کر سکتا،

جھونپڑے کا یہ مکیں — یعنی یہ شیطانِ ضعیف!!

بھُوک کا مارا ہُوا، غم سے نڈھال اور نحیف!!

اپنی نظریں بھی گنہ گار نہیں کر سکتا،

کوئی فتنہ کبھی بیدار نہیں کر سکتا،

یہ تعفّن کدے — جن کے ہے مکیں نوعِ رذیل

اِن کے ساتھ انکے شیاطیں بھی ہوئے خوار و ذلیل

یہ مکاں — اور یہ محل!! صاف سجیلے پُر نور

جن سے لہراتا ہُوا اُٹھتا ہے دن رات دھُواں

سہمی سہمی ہوئی آتی ہے نظر بھوک یہاں

اِن میں آباد ہیں دنیا کے خدائے مشہور

جن کے اعصاب پہ طاری ہے نشاط اور سرور

یہ مکاں اور یہ محل، صاف، جمیل اور بلند

ان کا شیطان گراں قدر ہے اور آفتِ کار

دیو قد، صاحبِ عظمت، قوی ہیکل، بیدار

علمِ ادبار کا اُستاد، جواں عیش پسند

حیرت انگیز گناہوں کے لئے صحت مند

جب بھی دیکھو اسے آفت بہ نظر، فتنہ بدست

بھوک، افلاس، تمدّن کے کمالاتِ مہیب

اس کی چنگیز شعاری کے ہیں آلاتِ مہیب

سامنے اس کے خداوند کے بھی حوصلے پست

جس کو ہر عرصۂ پیکار میں دی اس نے شکست

یہ تکلف کدے — جن کی ہے مکیں نوعِ جمیل

یہ گراں قدر و جلیل ان کے شیاطیں بھی جلیل

"ساقی" اپریل ۴۴ء ۲۵ ر فروری ۴۴ء

خُداکی دین

نندو، بھرتا، ننھیا، دھنّو، موہنیا اور بھگوانا
چھ بچّے — فاقہ، عریانی، میل، کثافت، کیچڑ، دھول!!
گردھر نے بے سوچے سمجھے گھر میں لگادی جن کی بھیڑ
جیسے جنگل میں اُگتے ہیں، پتّے، غنچے، کانٹے پھول!!
شادی ایک مقدّس فرض اتنی اولاد خدا کی دین —

راہ میں خلدِ نظر بنتے ہیں راہ کے رخشندہ ساماں
ان نظّاروں پہ جائے تو کیسے جائے اُس کا دھیان

مل کی کلوں سے ہار کے جو گھر کو لوٹے ہو کر ہلکان

اپنے دل کو — اپنی نظر کو نظّاروں میں جو الجھائے

اتنی غذا کی دین کو پیہم فاقوں سے کس طرح بچائے

کون سی مل کا مالک ایسا ہے جو گھر بیٹھے کو کھلائے

شام آئے — جسموں کی کلیں اور مل کی کلیں بے حس ہو جائیں

بھُنے چنوں کی پوٹلی باندھے گرد ہر سیدھا گھر کو آئے

خواب آور — چاؔ پھر رانی بھُنے چنے — بچّے سو جائیں

دیا بجھے پھر کڑوے تیل کا گھر کی رانی پاؤں دبائے

نظر وہاں سب بال و پر ہے — جہاں گھنا اندھیارا چھائے

تاریکی اسرار سراسر اس کا کون حجاب اٹھائے

دل محنت سے چُور مشقّت سے عاجز کیسے بہلائے

گرم تبسّم نرم لبوں پر سارے دن کی تھکن مٹائے

ایک ہی لذّت اُس کا بھی ہے گھور اندھیرے میں امکان
گردھر کی تقدیر نہیں بن سکتے رخشندہ سامان۔
تھکن مٹائے کنبہ پھیلے آئے سال —— خدا کی دین!!

گھر میں رقصاں ہیں جو بہاریں پھول ہیں پھول نہیں تو دھول
گھر کی لونڈی ہے جو مسرّت پھول کھلا یا پھول مروڑ۔!!
بھوکے کی بس ایک ہی راحت ہے —— یہ بھوک خدا کی دین
بھوکے ملکوں کی آبادی چالیس اور پچاس کروڑ۔!!

"ادبی دُنیا" جولائی ۴۵ء

۹ر اپریل ۴۵ء

اعادہ

آؤ بھی — بیتے لمحوں کو آواز مل کے دیں

آؤ بھی — ایک دن تو کریں صرفِ انبساط

دو چار قہقہے ہیں اگر اپنی کائنات —

آؤ بھی — ان کو مصرفِ راحت میں لائیں ہم

اُٹھو کہیں خوشی نہ رہے اپنے بس کی بات

آؤ بھی یادگارِ محبّت منائیں ہم —

گذری ہوئی بہار کو — واپس بلائیں ہم

زلفوں کے انتشار میں چولھے کی راکھ ہے

دھو ڈالو ان کو عطر سے ان کو سمیٹ لو

معمول کیوں نگاہ کا ہو منظرِ کثیف ۔؟

اُٹھّو کوئی رنگی ہوئی ساری لپیٹ لو ۔

اُٹھّو کسی سہیلی کے ہاں بن سنور کے جاؤ

باتوں میں اتنا اُلجھو کہ گھر دیر کر کے آؤ!

کرنے دو آج پھر مجھے خلوت میں انتظار

کرنے دو آج پھر مجھے دل وقفِ اضطرار

پھر آج ـــــ اپنی ٹھوڑی پہ رکھ رکھ کے انگلیاں ،

مجھ سے کہو ـــ "دکانوں میں آئی ہیں ساریاں"۔

ایجاد وہ ادا ہو ـــــ نہ انکار کر سکوں

نشّے سے بیخودی سے چھلک جائیں انکھڑیاں

بازار سے مٹھائی، تر و تازہ پھل منگاؤ

تھالی میں اپنے ہاتھ سے ان سب کو پھر سجاؤ

آنکھیں جھکا، لجا کے کہو مجھ سے — "آؤ کھاؤ"

شکوے تمہیں جو مجھ سے ہوں — آؤ بیاں کرو

ضد — اور روٹھنے کے بہانے تراش لو —

پھر وہ "نہیں" شعار بنے، پھر نہ ہاں کرو —

آؤ بھی بیتے لمحوں کو آواز دے کے دیں،

آؤ بھی — یادگارِ محبت منائیں ہم

لبریزِ رنگ و کیف کوئی گیت گائیں ہم

کونین مسکرا اُٹھے یوں مسکرائیں ہم

"ساقی" جون ۴۵ء ۲۵ جنوری ۴۳ء

صُبح

سحر ہوئی کہ اِک اعلانِ گیر و دار ہوا،
فروغِ صبح سے شب کا سکوں فگار ہوا،
طلوعِ مہر سے آغازِ انتشار ہوا،

درِ جمیل پہ دستک۔ بہن کا خط لائی
پڑھی "مصیبتِ مضموں" تو دل پہ چوٹ آئی
بہن کے آخری دیدار کو چلا بھائی

جوان موت پہ جو سوتے تھے فغاں کرتے
ہزار خوبیاں مرحوم کی بیاں کرتے
چلے سپردِ لحد کرنے سسکیاں بھرتے

اُٹھا غبار — لباسوں پہ پٹنے کے لئے
کھُلی دکانیں — مسرّت سمیٹنے کے لئے
جہاں کو بھُوک کے غم میں لپیٹنے کے لئے

سیاہ مست اُٹھے — راتوں کے تاجدار اُٹھے
نشاطِ شب کے تصوّر سے ہمکنار اُٹھے
اُٹھے اذیّتِ امراض کے شکار اُٹھے

گناہِ عیش کا روزِ سیاہ آپہنچا
خوشی کا وقت گیا — حکمِ آہ آپہنچا
سپاہیوں کو لیے قرض خواہ آپہنچا

کھلیں گے قصرِ عدالت — عجب فضا ہوگی
ستم کی مجرمِ عشرت پر انتہا ہوگی
ابھی ابھی جسے اندوہگیں سزا ہوگی،

نوا و رنگ سے لبریز راستہ ہوگا
سڑک پہ موٹروں، تانگوں کا جمگھٹا ہوگا
ابھی ابھی کوئی غمناک حادثہ ہوگا

یہ صبح نور کا طوفان — صباحتوں کا ظہور
مصیبتوں کا فروغ اور آفتوں کا ظہور
کہ روشنی ہے جہاں میں قیامتوں کا ظہور

مَیں تیرہ بخت ہوں راتوں سے کیوں نہ پیار کروں
مَیں ایسے سینکڑوں دن رات پر نثار کروں
چراغِ مہر کے بجھنے کا انتظار کروں

"ادبِ لطیف" مئی ۴۴ء ۱۳ دسمبر ۴۳ء

گرتی ہوئی دیوار

فلک پہ ابر گھٹاؤں سے آ رہا ہے
جس کی چھت اتنی پرانی ہو وہ برباد مکاں
کم نہیں ایک قیامت سے مکینوں کے لئے
وقت — خونخوار شکاری ہے جو ہر لمحہ کے بعد
اپنے جھولے میں نئی لاش گرا لیتا ہے
سر کے بل آہنی تعمیر گری جاتی ہے
جیسے ٹھوکر کھا کبھی نہ سجدے سے اُٹھائے گی کبھی

وقت کے ہاتھ کا مسلا ہوا اک جسمِ نزار
سر کے بل گرتا ہوا ایک ستونِ ہر کشش —!!
آنکھیں سکڑی ہوئی پلکوں سے ڈھکی ہیں جس کی
جیسے جھُلسے ہوئے طاقوں میں بجھی شمعیں ہوں
اسپتال آیا ہے —— ہمراہ جوانی لیکر
اک دمکتے ہوئے چہرے پہ گھنے گیسو ہیں،
جیسے چڑھتے ہوئے سورج کی رو پہلی کرنیں!!
روز بکتا ہے یہ چہرہ —— یہ سنہری زلفیں
عہدِ حاضر کے تمدّن کا خدا کاغذ ہے،
جس کے نقشین سے اک پارۂ رنگیں کے عوض،
روز بکتا ہے یہ چہرہ، یہ سُنہری زلفیں
تاکہ ترسے نہ دوا کو دمِ آخر آںّاں۔

تاکہ ہوں — آنکھ میں اماں کی نگاہیں پیدا

کس قدر شوق ہے بڑھیا کو جواں ہونے کا

اپنی بیٹی کی جوانی کئے جاتی ہے ہلاک

ابتدا ہی سے قدامت ہے حریفِ تجدید

لیکن اب وقت اجازت نہیں دیتا اسکی

ہر ستم دوستِ قدامت کو فنا ہونا ہے

وقت ہر آہنی تعمیر گرا دیتا ہے

باسی پھولوں کو بھی — گلداں میں سجاتا ہے کوئی؟

جمع خاکستر و خاشاک بھی کرتا ہے کوئی —؟

پھر سے ٹوٹے ہوئے تارے بھی اُٹھاتا ہے کوئی؟

ساقی مارچ ۱۹۴۴ء ۲۹ نومبر ۱۹۴۳ء

مرگِ ناگہاں

اندھیری رات میں پیچھے سے وزنی ہاتھ گردن پر
ہتھوڑا جیسے آہنگر کا بیٹھے سُرخ آہن پر
ابھی دُرگت پر اپنی بےخبر رہگیر تھا حیراں
کہ چوکیدار کی آواز دیواروں سے ٹکرائی
"بتا یہ کِس کا تالا توڑنے کے آج تیور تھے؟"
محلّے والے جب پہنچے تو سب آپے سے باہر تھے
کِسی نے گال سہلائے کِسی نے پیٹھ سہلائی
ہوئی فریاد و زاری بھی نہ اُسکے درد کا درماں
پڑوسن کی دوا لانے بچارا گھر سے نکلا تھا
اندھیری رات میں قسمت کا مارا گھر سے نکلا تھا

درِ مفلس پہ دستک اک پیامِ جانگزا لائی
"کہیں کونے میں پڑ رہنے دو میں دکھیا ہوں اے بھائی"
دلِ انسانیت جذباتِ ہمدردی سے بھر آیا
سحر ہوتے ہی پہنائی گئیں ہاتھوں میں زنجیریں
"بتا یہ کس کی بیوی اغوا کر لایا ہے او غنڈے ۔؟"
"بتا اے بیسوا۔!! اس سے تعلّق تھا ترا کب سے ۔؟"
اس استفسار پر دونوں بنے پتھّر کی تصویریں
وہ ممنوں ہو کے پچھتائی وہ نیکی کر کے پچھتایا
"نہیں بولو گے تم سیدھی طرح پہچانتا ہوں میں
تمہارے روگ کی کیا ہے دوا یہ جانتا ہوں میں"
طمانچے کھا کے بھی بے بس نہ دل پر میل کچھ لایا

ذرا دیکھیں تو نالے میں پڑا ہے کون سر کے بل -!!

وہی موٹا مہاجن ــــــ اور شرابی لالہ شّبا مل

بڑی مشکل سے تانگے میں اُسے دونوں نے بٹھلایا

مگر بادہ گسارِ پیر نے رستے میں دم توڑا

ٹھکانے پر پہنچتے ہی انہیں خلقت نے آگھیرا

ہر اک جانب سے اُن کو عالمِ حیرت نے آگھیرا

پلائی تم نے کیوں اتنی کہ لالہ جی نے تن چھوڑا"

رعونت نے مگر کچھ اور ہی ارشاد فرمایا۔

"بتاؤ تم نے اس کے جام میں کیا شئے ملائی تھی؟

کہاں ہے وہ رقم جو تم نے جیبوں سے نکالی تھی؟"

خدائے عدل نے امداد کو بھی جرم ٹھہرایا

ساقی ظریف نمبر ۱۹۴۵ء ۲۷ فروری ۱۹۴۳ء

اُٹھ...

کیا ہوا رات، کو نمناک ہوئی جاتی ہے
تیرگی اور بھی غمناک ہوئی جاتی ہے

آج فطرت کے شبستاں میں ہے ماتم کیسا
غم ہر اک چیز میں موجود ہے پھر غم کیسا

اُٹھ کہ یہ گردشِ ایّام ہے خونریز بہت
شہپرِ عمر کی پرواز بھی ہے تیز بہت!!

عمرِ ہاں عمر ––– تجھے عمر کا ادراک نہیں
اس کا آغاز اور انجام خطرناک نہیں

عمر بھر ہم سے مصیبت زدہ افراد کی عمر
فرصتِ نوحۂ غم، کشتۂ بیداد کی عمر
اُٹھ کہ یہ رات بھی باتوں میں گذر جائے گی۔

یہ ترے چمپئی رخسار، کٹیلی آنکھیں
خلد کی کوثر و تسنیم نشیلی آنکھیں
خلد ہاں خلد تجھے خلد کا ادراک نہیں
اس گلستاں میں سنا ہے خس و خاشاک نہیں
خلد اک شاعرِ مفلس کی تعلّی ہی تو ہے
ہم غریبوں کے لئے ایک تسلّی ہی تو ہے
کتنے ناداں ہیں خیالوں سے بہل جاتے ہیں
کس قدر جلد توہم پہ یقیں لاتے ہیں
یہ فلک، چاند ستارے یہ اُفق اور یہ زمیں،

کون کہتا ہے جہاں گلشنِ فردوس نہیں
اِک نہیں ہے تو ہمارے ہی لئے خلد نہیں
ورنہ ہر گام پہ موجود ہے فردوسِ بریں
قبل اس کے کہ دریچے سے سویرا جھانکے
آ ذرا خرقۂ عسرت کے اُدھیڑیں ٹانکے
اُٹھ کہ یہ رات بھی باتوں میں گذر جائے گی۔

ادبی دُنیا نومبر ۴۳ء ۲۸ر ستمبر ۴۳ء

برہمی

یہ زمیں یہ آسماں میرے قفس کی تیلیاں
یہ جہانِ ہاؤ ہو، بے رنگ، بے پایاں بسیط
چاند تارے روزنِ زنداں مگر گردوں مقام
یہ جہاں اور اس کی وسعت ایک زندانِ محیط
بخت — آدابِ قفس کا جانگداز اک سلسلہ
عمر — انفاسِ حزیں کا تیز گام اک قافلہ
زندگی — زندانیِ غم کا بھیانک حوصلہ
یہ زمیں، یہ آسماں زندانِ غم کے بام و در

یہ در و دیوار ابھی تک زنگ آلودہ نہیں
عمر کا پیچیدہ نرغہ — بخت کا رقصاں بھنور
قید و بندِ غم سے میں ذرّہ بھر آسُودہ نہیں
پاؤں زنجیرِ ازل کے بوجھ سے شل ہو گئے...

یہ بنی آدم — یہ آب و گِل کے رنگیں لوتھڑے
یہ تمدّن جن کے اور اک جنوں پرور کا کھیل
شغل جن کا افترا، بغض و حسد، مکر و ریا
ان کا مذہب جیسے کچھ بچّوں کے ہاتھوں میں غلیل
ان کا خالق — ایک پرتو، اک خیال، اک واہمہ
جابر و دلدار، جذباتی، تلوّن آشنا —
جعلساز دل کا معاون، بزدلوں کا آسرا

عشق جن کی بھوک اندھی، جان لیوا اور شدید

حسن جن کے تشنہ لب جذبات کی آسودگی

ان کا اخلاق ایک بے معنی حکایت کا ورق

ان کی دُنیا ایک رنگیں شورِ آلُودگی

مَیں بھی ہوں اس المیہ کا ایک کردارِ خراب

منظرِ تمثیل کی رعنائیوں میں کھو چکا

حسبِ فطرت ہنس چکا حسبِ مقدّر رو چکا

صبح ہونے کو ہے سو جاؤں تماشا ہو چکا

ہمایوں۔ مارچ ۴۴ء ۱۳ر فروری ۴۴ء

جاگتے کا خواب

جی میں ہے کہ گم گشتہ نگاہوں کو بلا لوں
پھر حسبِ نظر آج تصاویر بنا لوں
یہ ذہن کا فنکار ہے تعمیر تسکیں

وہ شیش محل ہے مَیں یہاں آتا ہوں اکثر
چاہوں تو پری چہرہ کنیزیں بھی بلا لوں
وہ آگئیں — ہاتھوں میں لئے شیشہ و ساغر

وہ سامنے جو ہرے کے ہیں سنسان کنارے
چاہوں تو کوئی گاؤں کی دوشیزہ بلا لوں
وہ آبھی گئی آتے ہی کپڑے بھی اُتارے
وہ چھینٹے اُڑے اُس نے خد و خال نکھارے
وہ سامنے کھڑکی سے کوئی جھانک رہی ہے
چاہوں تو اس "آفت" سے ابھی بیاہ رچا لوں
وہ میری دلہن پھولوں سے گہنوں سے لدی ہے
شہنائی کی تانوں سے گلی گونج اُٹھی ہے

فرصت کے کرشمے ہیں تخیّل کی اُڑانیں
ہر ہر نفسِ زیست ہے آویزشِ تازہ۔!!
راہوں میں اُبھر آتی ہیں مضبوط چٹانیں،

کھنچتی نہیں کھینچے سے خیالوں کی کمانیں،
ظلمت میں غنیمت ہے سحر دیکھ رہا ہوں
ہر رنگ کی فردوسِ نظر دیکھ رہا ہوں
مضبوط چٹانوں کے اُدھر دیکھ رہا ہوں

کتاب ستمبر ۴۴ء

۲۹ مارچ ۴۴ء

واماندگی

تھک چکا ہستئ موہوم سے لڑتے لڑتے
عمر کی موت کے سامان میسّر ہی نہیں
ختم ہونے میں نہیں آتے شب و روزِ طویل
اتنی فرصت میں بھی تسکین مقدّر ہی نہیں
میری تحویل میں عشرت کی نہیں کوئی سبیل
طے رہِ زیست ہوئی جاتی ہے گرتے پڑتے

زندگی صرف جئے جانے کا ہی نام نہیں
زندگی کا یہی مقصد ہے تو مخلوقِ جہاں،

کیوں شب و روز رہا کرتی ہے اِتنی مصروف
ذرّے بھی راہیٔ مہ و مہر بھی گرداں گذراں
زندگی فرصتِ یکجس پہ نہیں ہے موقوف
عمرِ بے کیف فقط گردشِ ایّام نہیں

زندگی — قلزمِ ایّام کے گرداب کی موج
ہے تو پھر کیوں نہ اُٹھوں اور بڑھوں ساحل کیطرف
دوریٔ ساحلِ ناپید سے مَیں کیوں گھبراؤں
موج ہوں — موج میں بڑھتا رہوں منزل کیطرف
راہ میں جو کوئی حائل ہو اُسی سے ٹکراؤں
موج اگر ہوں — تو بنوں روندتے سیلاب کی موج

ادبی دنیا مئی ۴۵ء — ۱۲ مارچ ۴۳ء

دلاسا

سکھ کے دن بیت گئے

اِک نئے درد سے ہونا ہے دوچار

ہوتا جاتا ہے تو ہونے دے جہاں تیرہ و تار

غم و آلام نے انساں کا بڑھایا ہے وقار

غم و آلام نے — کی ہے دلِ انساں پہ جِلا

اِک دفعہ اور مصیبت کے ستم خانے سے

باہوں کو باہوں میں ڈالے ہوئے ہم ہنستے ہوئے نکلیں گے۔

یاد ہو گا تجھے گونجی تھیں محل میں چیخیں —!!

ماں تا آنکھوں میں بھر لائی تھی رخشندہ لہو کی بوندیں

غمزدہ باپ نے دم توڑا تھا گرتے ہی محل کی چھت سے

جان لیوا ہے کوئی غم تو ہے اولاد کا غم —!!

بارہ سالوں کی ہمیں دشت نوردی کے ملے تھے احکام

ایک عورت کی منظّم سازش

کتنی پُر ہول مصیبت کا بنی تھی پیغام

پھُول سے تلووں میں چھالوں کی بہار آئی تھی —

چیتھڑے چیتھڑے ملبوس ترے جسم پہ تھا

بچھّوؤں، سانپوں، درندوں سے لرز جاتا تھا ہر گام پہ دل

پھر ترا اغوا، تری فرقتِ جانسوز کا آغازِ حزیں

وہ مرا دورِ جنوں، عہدِ فغاں،

اِک دفعہ پھر تو بنی تھی سببِ جنگ و جدال
اِک دفعہ اور کڑی جنگ کے بعد
باہوں کو باہوں میں ڈالے ہوئے ہم ہنستے ہوئے آئے تھے —

یاد ہونگے تجھے وہ لیل و نہار — !!
اِس مصیبت کو بھی صدیاں گذریں،
پھینک آئے تھے بیاباں کے کنوئیں میں مجھے بھائی مل کر
غمزدہ باپ کی شفقت سے لبالب آنکھیں
بجھ گئیں — روزنِ زنداں کی طرح بند ہوئیں
گریۂ شام و سحر مشغلۂ زیست ہوا
ابھی جینا تھا مجھے تیرے لئے جینا تھا
قافلہ ٹھہرا، تھکا ہارا کئی روز کا بھوکا پیاسا

ایک پیاسے نے کنوئیں میں جھانکا

اُس نے دیکھا کہ مرے چہرۂ زیبا سے چراغاں ہے کنواں

قعرِ تاریک سے نکلا تو مصیبت بھی نئی آ پہنچی

چند سکّوں کے عوض بیچا گیا مصر کے بازاروں میں

روزِ آغاز سے بکتا چلا آیا ہے جمال اور شباب

تُو بھی تھی میرے خریداروں میں

یہ مصیبت نہ ہوئی ختم یہیں

یہ مرا حسن مرے واسطے آزارِ دل و جاں نکلا

فنِّ تخلیق کا فتنہ ہی تو ہے حسن و جمال

برسوں رکھا گیا محبوسِ ستم خلوتِ زنداں میں مجھے

اِک دفعہ اور مصیبت کے ستم خانے سے

مسکراتا ہوا بس ہنستا ہوا آیا تھا

منتظر تھے مرے زنداں کی فضا سے باہر

مصر کا تخت، حکومت، عظمت

تو، ترا حسن، ترا پیار، — یہ تیری آغوش!!

یاد ہے مجھ کو وہ محفل، وہ حریفوں کے شگفتہ چہرے

آخری داؤ بھی مَیں ہار چکا تھا اُن سے

سرنگوں فرطِ ندامت سے تھا میں

جب تجھے بالوں سے پکڑے ہوئے لائے تھے بھری محفل میں

پھر حریفوں نے مرے حکم کیا تھا صادر

"کھینچ لو جسم سے ملبوس تمام، اس کو برہنہ کر دو

اور — اسے رقص پہ مائل کر دو"

تیری ساری پہ ہوا دستِ "دشاسن" مصروف

بے بسی تیری غم انگیز تو تھی

مجھے مجبوری نے تلوار اُٹھانے ہی نہ دی

دم بخود بیٹھے رہے اپنے بزرگ ——!!

چُپ تھے تقدیس کی توہین پہ سر اپنا کٹانے والے

جانے کیوں گرم رگوں میں اُن کی

پڑ گیا سرد حمیّت کا لہو ——!!

اِک دفعہ اور کڑی کشمکشِ سخت کے بعد

بزمِ تحقیر سے ہم ہنستے ہوئے اُٹھے تھے ——

ہوتا جاتا ہے تو ہونے دے جہاں تیرہ و تار

غم نے انساں کا بڑھایا ہے وقار

یہ نہ سوچ —— آفت و آلام سے تنگ آ کے کئی شاہوں نے

یہ الم زار جہاں تیاگ دیا —!!

رُخِ تاریک پہ تصویر کے کیوں اپنی نظر دوڑائیں

بات یہ سوچ کہ کس طرح مصائب سے ہوئی جنگ اپنی

اور ہم کیسے مصیبت کے ستم خانے سے

باہوں کو باہوں میں ڈالے ہوئے ہنستے ہوئے آجاتے تھے

آج پھر ٹوٹنے والا ہے مصیبت کا پہاڑ

آج کیوں دل میں ہو خوف اور ہراس

ادب لطیف جون ۴۶ء ۹ر فروری ۴۵ء

زندگی

آوارہ سر ہے راہگذاروں میں زندگی
جکڑی ہوئی رسوم و سلاسل میں ــ نوحہ خواں
سوئی ہوئی سڑک کے کنارے برہنہ تن
بیٹھی ہوئی سجائے ہوئے جسم کی دکاں
محبوس تنگ و تار مکانوں میں ــ فاقہ کش
کرتی ہوئی نمائشِ عشرت، پسارے ہاتھ
مسلی ہوئی، سسکتی ہوئی، ہانپتی ہوئی
باغات میں ٹہلتی ہوئی تمکنت کے ساتھ
آزاد رسم و راہ سے ہاتھوں میں ڈالے ہاتھ

سڑکوں پہ گرد اُڑاتی ہوئی موٹروں میں بند
غمزوں پہ، تال سُر پہ امارت بکھیرتی
کرتی شباب، خلوتِ شب کے لئے پسند
میزوں پہ نعمتوں کو نمایاں کئے ہوئے
چہروں کو فیضِ طب سے گلستاں کئے ہوئے
جسموں کو رنگ و روغن و غازہ سے لیپتی،
ملبوس میں چھڑکتی ہوئی عنبر و گلاب
اِک جنبشِ خفی سے سرِ عزّ و ناز کی
رہگیروں کے سلام کا دیتی ہوئی جواب
اپنی تجوریوں کے ذخائر سے کھیلتی
کاغذ پہ اپنی لوٹ کا کرتی ہوئی حساب
اپنے مفاد اور مقاصد کے واسطے

نادار زندگی کو بناتی ہوئی عذاب

مکروہ جھرّیوں میں — الم دوست، نیمجاں
کرتی ہوئی مآل کا شدّت سے انتظار
پھوڑوں میں، پھنسیوں میں سسکتی، کراہتی
اُکتائی، تنگ آئی ہوئی — وقفِ اضطرار
قاتل کے بے نیازِ ترحّم وجود میں
سہتی ہوئی ضمیر کے اندوہناک تیر
پاگل کے پیرہن میں لٹائے ہوئے حواس
آشفتہ سر بنی ہوئی تفریحِ راہگیر

کس درجہ دلفریب ہے کتنی گھناؤنی
پُرکیف زندگی یہی بے کیف زندگی!!

۱۳ مئی سنہ ۴۵ء

قنوطیّت

نور سے برق نے گردوں پہ لکیریں کھینچیں
کسی بھُولے ہوئے قصّے کی عبارت لکھّی
ابر کے سینے میں سوئی ہوئی دھڑکن جاگی
نیلگوں دیدۂ افلاک سے اُمڈا سیلاب
پیڑ کے پتّوں پہ بجنے لگا ساون کا رباب
بجھ گئے چاند کے افسانے کے پُرنور ابواب
سرد نمناک ہواؤں کے تھپکتے ہوئے ہاتھ
لائے میرے لئے سپنوں کا جہاں اپنے ساتھ

سوچتا ہوں کہ فقط سانس گنے ہیں مَیں نے

زندگی مصرفِ بے کار رہی ہے کتنی

نیند اُڑا دیتا ہے اس دل کا دہکتا ہوا درد

زندگی عمر سے بیزار رہی ہے کتنی !!

کل ستاروں کی طرف دیکھ کے مَیں سوچتا تھا

آسماں نور کے پھُولوں سے بھرا گلشن ہے

کل — سرِ شاخِ نشیمن جو نظر آتا تھا —

مَیں سمجھتا تھا کہ گیتوں کا کوئی مسکن ہے

کل — نگاہوں سے چھلکتی تھی شگفت مہ و مہر

آج — ہنستی ہوئی آنکھیں، یہ دمکتے تارے

آج — یہ برق کی لہروں کے فروزاں دھارے

پیڑ کے پتّوں پہ بجتا ہوا اسا دن کا رباب !!

سرد نمناک ہواؤں کے تھپکتے ہوئے ہات

اور ـــ اُٹھتی ہوئی سینے سے زمیں کی خوشبو

یہ ہر اک لمحہ چھلکتے ہوئے دن، سرمئی رات

میرے دل پر کوئی یلغار نہیں کر سکتے

دیدہ و دل میں کوئی رنگ نہیں بھر سکتے

ساقی جون ۴۴ء

۱۸ اپریل ۴۴ء

کشمکش کے پانچ سال

(دوسری جنگِ عظیم کے تاثرات)

جبر کی آگ سے سینے میں جو لاوا بھڑکی
ذلّتِ جبر نے احساس کو بیدار کیا
کچلی، مسلی ہوئی جبیں رگِ غیرت پھڑکی
ظلم نے ـــ ضبط کو آمادۂ پیکار کیا
بجھ گئے جتنے بھی پلکوں پہ فروزاں تھے دیئے
چوٹ کھائے ہوئے اجسام اُٹھے، آگ پیئے
عزم و ایثار لئے، قوّت و ادراک لئے

برف زاروں میں تمازت کا اُبال آہی گیا
روحِ مقہور کے چہرے پہ جلال آہی گیا

پہلا سال ——— اور ہمہ گیر ہُوا خوف و ہراس
بھُوک نے خستہ جوانی کو گھروں سے کھینچا
روکتی رہ گئی آنکھوں کی نمی چہرے کی یاس
ضبطِ پیکار کو انساں نے لہو سے سینچا ———
دوسرے سال ——— خلش اور بڑھی، اور بڑھی
گھر کی پس ماندہ، حیادار جوانی بھی گئی
جاوداں ہو گئی آنکھوں کی نمی، دل کی غمی ـــ
تیسرے سال ——— اُٹھی سینۂ مجبور میں ہُوک
پیٹ میں ——— اور رگ و پے میں مچلنے لگی بھُوک

چوتھا سال ۔ اور خیالات اُگلنے لگے آگ

کاوشِ فکر میں غنچے، نہ گلستاں نہ بہار

ذہنِ گلبار سے برسا نہ کوئی شعر نہ راگ

ذہن و افکار سے جھڑنے لگے جانسوز شرار

پانچواں سال ۔ پھر ادبار کی ہونے لگی جیت

آج تک نظمِ مشیّت کی نہیں بدلی ریت

یہ زبردست خدا بھی ہے زبردست کا میت

موج سر اپنا چٹانوں پہ پٹکتی ہی رہی

سر برآور وہ چٹانوں کی جبیں جھک نہ سکی

پانچ سالوں کی تگ و دو کا بھیانک ہے مآل

آدمی پھر اُسی آفت کا نوالا ہوگا

زیست ہے پھر وہی دیرینہ خلش دوزسوال

کیا کبھی دل کے اندھیرے میں اُجالا ہو گا؟

سعیِ تسکیں میں تو ہم اور بھی ناشاد ہوئے

حربِ تخریب کے کچھ اور بھی ایجاد ہوئے

پانچ سال اپنے حسیں عصر کے برباد ہوئے

پانچ سالوں میں کئی کام بنا سکتے تھے

نئے تاج اور نئے اہرام بنا سکتے تھے

اِک نئی صبح، نئی شام بنا سکتے تھے

ہمایوں مئی سنہ ۴۴ء ۲۳ مارچ سنہ ۴۴ء

اُدھوری آرزوئیں

ہمسائی کا دبا ہوا، بھرا ہوا شباب
پردے کے تانے بانے میں کھاتا ہے پیچ و تاب
بوڑھا میاں ـــ ہے جس کا خزانے پہ بیٹھا ناگ
وہ خود بچاری ـ!! ابر کے نرغے میں آفتاب
بن ٹھن کے جب نکلتی ہیں اُس کی پڑوسنیں
ہوتا ہے انتشارِ نظر اُس کا اضطراب
جی میں ہے موقع پا کے اُسے جا کے یہ کہوں
"آؤ تمہیں بھی میں ـــ اسی سج دھج سے لیچلوں"

اِک میرے رشتہ دار ہیں خوش پوش خوش جمال
رہتا ہے رکھ رکھاؤ کا ان کو بہت خیال
بیوی حسین ہے اُن کی مگر سادگی پسند
اُس کو سمجھتے ہیں وہ گنوار اور بد خصال!!
اُن کے لئے نہیں ہے سزاوارِ التفات
میکے میں سڑ رہی ہے وہ بدبخت، خستہ حال!!
جی میں ہے ایک دن چلوں اور اسکو لاؤں میں
گھر لاؤں — اپنی پھر اُسے دلہن بناؤں میں

تاجر ہے اک پڑوس میں زردار، مال دار
کرتا ہے لین دین کا خوش حال کاروبار
کنبے کی دیکھ بھال کی فرصت نہیں جسے

کچھ اِس قدر طویل ہے جس کا نظامِ کار
اُس کی سڈول جسم کی بیوی ہر ایک شام
کرتی ہے ایک چھابڑی والے کا انتظار
مجھ بیں ہے جب وہ کاڑھے ہو گھونگٹ کھڑا ہوں میں
یہ پوچھوں — "چھابے والے سے بھی کیا بُرا ہوں میں؟"

ادب لطیف اگست ۴۵ء

۸ جنوری ۴۵ء

جواب دیجئے

زندگی تلخ حقائق سے گرانبار سہی
عمر آزار سہی، سانس بھی تلوار سہی
کائنات — اُلجھا ہُوا گیسوئے اسرار سہی
ذہن جنگاہ سہی، دِل بھی خلش زار سہی

رسن و دار سہی، زلفِ معنبر نہ سہی
آنکھ اشکوں کا سمندر سہی، ساغر نہ سہی
زندگی محبسِ ماحول سے باہر نہ سہی

سرخوشی، لطف و سکوں جزوِ مقدّر نہ سہی

سالہا سال کی گمراہئ حکمت بھی بجا
دِل کے انبوہِ تمنّا کی کثافت بھی بجا
فطرتِ آدمِ خاکی — کی رذالت بھی بجا
بھُوک اور خود غرضی اسکی وراثت بھی بجا

حُسن بھی جلوۂ تخریب بداماں ہی سہی
عشق بھی ایک ابدی شعلۂ جولاں ہی سہی
یہ طرب گاہِ جہاں — کلبۂ احزاں ہی سہی
چار سُو بکھرا ہوا موت کا ساماں ہی سہی

جینا دوبھر سہی — جینے میں مزا ہے کہ نہیں
زندگی بخش یہی خوفِ قضا ہے کہ نہیں؟

ذرّے ذرّے پہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہی سہی
پھر بھی گہوارۂ ظلمت کا خدا ہے کہ نہیں؟

۱۸ ستمبر ۴۵ء

ہمایوں نومبر ۴۵ء

کل، آج، کل

(کل جو گذر چکا ہے)

پیڑ کے نیچے ایک الاؤ ــــ اُس کے گرد

اُونگھ رہے ہیں ننگے وحشی، بھُوکے وحشی غم سے نڈھال

اِتنے میں اک وحشی اُٹھّا ــــ جھاڑی گرد

روشن کالی آنکھیں جس کی ــــ چہرہ زرد

بولا ــــ "میَں ہونے نہیں دونگا اپنی قوم کا خستہ حال

اُٹھو پڑوسی کے گھر میں ہے عزّت، روٹی، کپڑا، مال"

اُونگھتے بھُوکے، اُٹھے، جاگے ــــ کاٹے پیڑ

ملکے بھاری بنے سفینے ——— عالیشان

نیزے، بھالے، برچھے، چاقو ——— تیر کمان

ہوا فراہم قتل و غارت کا سامان

آندھی اُٹھی، اُمڈی چھائی، ہر سُو گونجی چیخ پکار

بوڑھے بِسمل، بچّے گھائل، گودیں ویراں، عصمت چاک

سارے پڑوسی زنجیروں میں ——— رقصاں انکے گھر میں خاک

(آج جو گذر رہا ہے)

گرم انگیٹھی پاس ہی اُس کے ——— میز کے گرد

سوچ رہے ہیں ریشم پہنے شائستہ، برتر، انسان

اُن میں سے ایک اُٹھا ——— ہاتھ میں لیکر جام

آنکھوں میں خنجر کی چمک ——— چہرہ گلفام

بولا پچھلی جنگ کا پہلے پورا کرنا ہے نقصان

اُٹھو پڑوسی کے گھر میں ہے سونے چاندی کا والان

پل میں بنی ناداروں کی اک بھاری فوج

حبّ وطن کا، ننگِ وطن کا لیکر نام

روٹی، کپڑے کا لالچ دیگر انعام

لے ہی آئے انسانوں کو زیرِ دام

لوہے نے لوہے سے کھیلی ہولی — گونجی چیخ پکار

بوڑھے بسمل، بچّے گھائل، گودیں ویراں، عصمت چاک

مسجد، مندر، قصر و کلیسا ریزہ ریزہ — جزوِ خاک

(کل جو گذرے گا)

سر رکھے اُبھرے سینوں پر — حوض کے گرد

سوچ رہے ہیں "فردوسِ مستقبل" کے خالق، انسان !!
ریشمی زلفوں پر اک اُٹھّا — پھیرتا ہاتھ
اُس کی محبوبہ بھی اُٹھی اس کے ساتھ
بولا "اپنے پڑوسی کی جنّت ہے کتنی عالیشان
اُٹھّو، چھینو شہد کی نہریں اُس کی حوریں اور غلمان"
"جوہر بم" پرسوز شعاعیں، مہلک گیس
فاش ہوئے سب ہنگامِ محشر کے راز
ہوئے مصائب کے سنگیں دروازے باز
بوڑھی ڈائن موت نے چھیڑا۔ اپنا ساز
شہر کھنڈر، خاموش فضائیں، بادِ نکہت زا مسموم
گھر والا کوئی نہ کوئی گھر — کوئی پیڑ نہ اُن پہ بُوم

بھوکے انسانوں سے توقّع رحم دکرم کی — خام خیال !!
کب آئیگا دورِ مسرّت، ذہن پہ کوئی بوجھ نہ ڈال

"ساقی" اکتوبر ۴۵ء ۱۲ ستمبر ۴۵ء

اِطمینان

میری تنہائی... بیاباں کی طرح چپ، سنسان
برف زاروں کی طرح سرد، بھیانک، ویران
میں نہیں شکوہ طرازؔ —!!
گیت ہیں پاس — رگ و پے میں جو دوڑ اٹھتے ہیں،
بجلیاں، کیف و سرود
میرے قبضے میں — تصوّر ہیں جو لہراتے ہیں،
گوشۂ خلوت کے دمکتے ہیں، نکھر جاتے ہیں

خامشی بولتی ہے۔

میری نظروں کی رسائی ہے شبستانوں میں
کیف زاروں میں ۔۔۔ بہاروں میں صنم خانوں میں

میری بے چارگی ۔۔۔ افلاس، مری مجبوری
میری قسمت کے ستاروں کی گھنی بے نوری

مَیں نہیں شکوہ طراز ۔۔۔!!
دل کا کیا ہے ۔۔۔ یہ بگڑتا ہے، منا لیتا ہوں
اسے تسکیں کا قناعت کا سبق دیتا ہوں

اُن کے آنچل بھی تو ہیں
پُرزے پُرزے ہی سہی ۔۔۔ خستہ، دریدہ ہی سہی
پردہ دارِ غم و آلام ہیں، غم پوش تو ہیں

کچھ دلاسے بھی تو ہیں

یہ بھی رسمی سہی — اوہامِ شنیدہ ہی سہی
مگر اک حربۂ آزار فراموش تو ہیں

میری فرصت بھی ہے — بے کیفیِ لمحاتِ خراب
میری تنہائی بھی بے رنگ، الم دوست، عذاب
میں نہیں شکوہ طراز — !!
میرے بچّے ہیں — کھلونے مرے، میری تفریح
میری عشرت کا جواز —

بڑھتے سیلابِ مصائب کے ستم سہہ لوں گا،
جس طرف موجیں بہا دیں گی مجھے بہہ لوں گا،

ہمایوں جولائی ۴۵ء ۸ مئی ۴۵ء

پیچ و خم

رستہ غبار و گرد کے گہرے دھوئیں میں گم
نقشِ قدم کہیں — نہ کہیں کشمکش کے داغ
دِل میں ہجومِ یاس و گماں پاؤں میں جمود
حیرت کے خار زار میں اُلجھا ہوا دماغ!!
جِس کے حریمِ حُسن میں سو وسوسوں کا راج
کب کا گذر چکا ہے خیالوں کا کارواں
یہ ذہن — یہ خیال و تصوّر کی رہگذر
کیوں بڑھتے بڑھتے ہوگئی مسدود ناگہاں

کیوں خضرِ راہ بنتی نہیں ہے کوئی دلیل۔

میں جانتا ہوں منزلِ مقصد۔ بعید ہے
دامن میں آکے گرتی نہیں خود بخود مُراد
ایثار کے بغیر میسّر نہیں ہوا ——
اِس دل کو کامیاب تمنّاؤں کا مواد۔
ایثار کیا ہے جبر —— خلافِ مزاجِ صبر
خوشیاں ہیں تیز گام مصائب ہیں سُست رو
اِک عارضی خوشی کے لئے صبر و ضبط ، جبر۔
اِس خام فہم دل کی حماقت نہیں ہے کیا؟
لیکن بچارے دل کو تدبّر سے واسطہ ——!!
عقل و خرد بھی تابعِ فطرت نہیں ہے کیا؟

یہ اور — ایسے لاکھ خیالوں کا سلسلہ

کھولا گیا — مگر نہ کھلا عقدۂ حیات

بڑھتے رہے ہیں۔ بڑھتے ہی جاتے ہیں اس کے پیچ

باتیں ہوئی ہیں بات سے پیدا ہوئی ہے بات

اِک پیچ سے بنائے گئے لاکھ پیچ و خم

پہلا ہی پیچ خالقِ ژولیدگی ہوا

تخلیق کے عمل میں تسلسل ہے کارگر

صنّاعِ دہر — صانعِ پیچیدگی ہوا

اُتری زمیں پہ نور سے کھینچی ہوئی شراب

طوفانِ رنگ و بُو میں ڈبوئی ہوئی بہار

زلفیں طلوعِ صبح کی کرنوں کا آبشار

آنکھیں کنوّل گلاب، سمن زار، نغمہ زار

تشبیہ جس کے حُسن کی موزوں نہیں ہوئی
اُس نورِ مشتعل سے بنایا ہوا شرار۔
عصمت، وفا، نباہ، محبّت، ریا، فریب
اِک پیکرِ جمیل — سمن زارِ رنگ و بُو
راحت فزا عیوب و محاسن کا امتزاج
رادھا کہیں، زلیخا کہیں، جولیٹ کہیں،
بالانشیں کہیں، کہیں تزئینِ تخت و تاج!!
راتوں کا نُور، دن کی ہنسی، شام کا نکھار
تخلیقِ دلربا ہی نہیں بنی حشرِ خلفشار
پہلا ہی پیچ خالقِ ژولیدگی ہوا
اِک چھیڑ ہی سے ہے غم و آلام کا ورود
نظروں کی چھیڑ — چھیڑ بنے عمر بھر کا روگ

موجوں کی چھیڑ — مان چٹانوں کے ٹوٹ جائیں

تاروں کی چھیڑ — ساز سے اُبلے سرود، سوگ

اس رہگذر کے موڑ پہ حیراں کھڑا ہوں میں

یہ سوچ بھی مرض ہے — بہت سوچتا ہوں میں

مَیں سوچتا ہوں — سوچ نہ ہوتی تو زندگی

بڑھتی ہر ایک راہ پہ آندھی کے جوش سے

مَیں سوچتا ہوں — سوچ نہ ہوتی تو انقلاب

آتا تو مجھ پہ کوئی تأثر نہ چھوڑتا —

آبادیوں کو دیکھتا اوڑھے ردائے خواب

مَیں سوچتا ہوں — سوچ نہ ہوتی تو یہ پہاڑ

دریا، درخت، سرمئی بادل، گرج کڑک

ہوتے مرے خدا، مرے ہیبت فزا صنم

اِن سے نبرد آزما ہوتا نہ بے دھڑک

پیڑوں کو کاٹ کاٹ کے بنتی نہ کشتیاں،

تبدیل پھر سفینے نہ ہوتے جہاز میں

ہوتے نہ پھر یہ موت اُگلتے ہوئے جہاز

سوئی ہی رہتی — آگہی دامانِ راز میں

اِک پیچ سے نکالے نہ جاتے ہزار پیچ

مَیں سوچتا ہوں — سوچ نہ ہوتی تو بے دھڑک

اِس راستے پہ بڑھتا مَیں بیگانۂ نشیب

ہے سوچ کا فساد تذبذب، یہی جھجک!!

حیراں کھڑا ہوں موڑ پہ گھبرا رہا ہوں مَیں،

یہ سوچ بھی مرض ہے بہت سوچتا ہوں مَیں

کتنے ہی موڑ، کتنے ہی گہرے خلا، نشیب

آتا نہیں یقیں مجھے طے کر چکا ہوں مَیں

نظریں ہیں واقعات کی منظر کشی میں فرد

تنہائیوں میں آئی ہے اکثر نگاہ کام

مَیں صبح و شام دیکھتا رہتا ہوں وہ مقام

مَیں صبح و شام سوچتا رہتا ہوں وہ خیال

پہنا سکوں جو ان کو حقیقت کا پیرہن —!!

برسے زمیں پہ نکہت و نزہت سرود و کیف

جس سمت بھی نگاہ اُٹھے کھل اُٹھیں چمن،

چہروں میں ہو شگفتِ مہ و مہر کا سماں

سینے ہوں بے پناہ محبّت کی انجمن!!

لیکن یہ میری سوچ — مری سادہ لوح سوچ!!

رکھتی نہیں ہے دشنہ و خنجر، فساد و شر

مَیں سوچتا نہیں کہ مرے پاس ہوں محل

آجائیں میرے قبضے میں کہسارِ سیم و زر

وسعت ہو جن کے سامنے دامانِ مختصر

میرے تو گھر میں رات کو بھی کے جلیں چراغ

میرے پڑوس میں ہو فلاکت کی تیرگی

اپنے لئے جلال و حکومت روا رکھوں،

ہمسائے رکھّوں صرفِ ستم، وقفِ خودکشی

مَیں سوچتا ہوں — سوچ مری سادہ لوح سوچ

رکھتی ہے لطف، مرہم و تسکیں، سکوں خوشی

مَیں سوچتا ہوں کیا نہیں ممکن علاجِ غم؟

یہ سر بلند — نکبت و افلاس کے ستوں

کیا ہو نہیں سکیں گے کبھی ٹل کے منہدم؟

میں سوچتا ہوں گریۂ مجبور کے لئے

دامانِ جانفزا، کوئی ریشم کی آستیں

ہر لمحہ بڑھتی ظلمتِ عالم کے واسطے

خورشید و ماہ سے بھی کوئی جلوۂ حسیں

یہ میری سوچ، اور یہ میرے خیال — کاش!!

پہنا سکوں میں ان کو حقیقت کا پیرہن

کیونکہ ہر ایک دور میں سعیِ سکوں مری

پروردگارِ رنج ہوئی — خالقِ محن!!

میں نے کبھی بنائی تھی لوہے کی تیغِ تیز

یہ تیغِ تیز — بھوک مٹانے کا ساز تھی

یہ تیغِ تیز تھی — کہ درندوں سے لڑ سکوں
یہ تیغِ تیز — میری حفاظت کا راز تھی
اِس تیغِ تیز سے وہ جرائم کیے گئے
تاریخ خاک و خوں میں ڈبوئی گئی تمام
مَیں نے بنائے کتنے ہی سازِ نشاطِ زیست
مَیں نے ابھی بنائے تھے طیّارے تیز گام
سڑکوں کے دُور دُور بچھائے تھے میں نے جال
چھوڑے تھے پانیوں میں سبک گام کارواں
راتوں کو دَوڑتی ہوئی سڑکوں کے ساتھ ساتھ
کھمبوں پہ کر دیا تھا ستاروں کو ضو فشاں
میں نے بنائے تھے سر و سامانِ انبساط —
تعمیر اُنہیں کیا تھا — مجھے سرخوشی ملے

آویزشِ حیات و اجل کے جہان میں
کچھ تو دلِ خراب کو آسودگی ملے —
غالب رہا ہے فطرتِ جنگ و جدل کا رنگ
پیکار و ظلم کی نہ مٹے گی کبھی اُمنگ
سطحِ زمیں پہ خون — ہوا اور فضا میں خون
تاریخ ہے جبھی تو شفق رنگ، لالہ فام
تاریخِ دہر رزم کی شاہوں کی داستاں
تاریخ میں نظر نہیں آتے کہیں عوام
وہ بھوکے لوگ — جن سے تھا شاہوں کا احتشام
جن کی تمام محنت و سرمایہ کا نچوڑ
بنتا تھا تاجدار کا، دربار کا شکوہ
جاہ و حشم کے، شوکت و نصرت کے بھوکے شاہ

کرتے تھے جن کے نذرِ وغا سینکڑوں گروہ
یہ جنگ بن چکی ہے طبیعت کا اقتضاء
میں دیکھتا ہوں رقصِ بہائم کا ارتقاء
وہ اِک دھماکا دُور ہوا گو نجتا ہوا
وہ سربلند — شیش محل بھک سے اُڑ گیا
سجدے میں سر کے بل وہ کلیسا بھی گر پڑا
پلکوں پہ دیکھتا ہوں — فروزاں دیئے ہوئے
تنہا ادھر گھروں میں اُمنڈتی جوانیاں
بیٹھی ہوئی ہیں صبر کا دارُو پیئے ہوئے
سرگرم اُدھر — دہکتی ہوئی رزمگاہ میں
تعمیر کر رہے ہیں شہنشاہوں کا شکوہ
آشفتہ سر شباب — لگاتے ہیں آئے دن

نوحہ بلب یتیموں کے بیواؤں کے گروہ

یہ سوچ بھی مرض ہے، بہت سوچتا ہوں مَیں

یہ سوچ میرے ذہن کا آزارِ مستقِل،

یہ سوچ — تیز گام، تنوع پسند سوچ!!

ہر لحظہ جھلملاتی ہوئی، کوندتی ہوئی

سیارِ عرش — سائرِ پست و بلند سوچ

کرتی نہیں ہے ایک ہی موضوع پر قیام

جس طرح مسکراتے گلستاں کی تیتری!!

آئے اور ایک پھول پہ بیٹھے، اُٹھے، اُڑے

جس طرح موج — چڑھتی، اُمنڈتی ندی کی موج

بل کھائے گھوم جائے، سنبھل جائے پھر مڑے

میں سوچتا ہوں میں. جو یونہی سوچتا رہا

زلفِ خیال سے جو یونہی کھیلتا گیا
رہ جاؤں گا اُلجھ کے ہجومِ خیال میں
اسرارِ کائنات یہ فہم و ذکا کے پیچ
ان سی تباہ کار مصیبت کوئی نہیں
کیوں اپنی زندگی سے محبّت نہ ہو مجھے
دو روزہ زندگی سی حقیقت کوئی نہیں
مَیں تو یہ جانتا ہوں کہ اِس سوچ سے نجات
ہوتی ہے کار زارِ تگ و دو میں جب نصیب
ہنستی ہوئی مجھے نظر آتی ہے کائنات

یہ سوچ ہی تو آبلہ پا ہے ــــ چھوڑ دوں
اُٹھوں کسی کی راہ نہ دیکھوں، بڑھوں چلوں۔

تعاقب

پردۂ سیمیں تھی سنیما ہال کا نکھری سحر
ایکٹرس کی طرح غازہ مل کے نکلی تھی سحر
اک حسینہ بجلیوں کے آنکھ میں خرمن لیے
آ رہی تھی ساتھ اپنے مغربی فیشن لیے
یوں ابھرے شانے تھے ریشم کے تلے ابھرے ہوئے
طشتری میں سیب جیسے ڈھانپ کر رکھے ہوئے
پنڈلیاں یوں غوطہ زن تھیں چال کے سیلاب میں

مچھلیوں کا رقص جیسے موجۂ گرداب میں

گدگدے گھٹنے تھرکتی ران ٹخنے گول گول

نعمتِ نایاب دل کو لے رہے تھے مفت مول

دیکھتے ہی اس کو رقصاں خوں رگوں میں جم گیا

مجھ کو شک گذرا جہاں پیمانہ زمانہ تھم گیا

کھینچ کر اس کے تعاقب میں مجھے دل لے چلا

دہر سے بیگانہ نظاروں سے غافل لے چلا

خواب سے چونکا تو میں تنہا اک اسٹیشن پہ تھا،

ہر طرف سے آ رہی تھی چھیبے والوں کی صدا

تھال تھے سستی مٹھائی کے نخالص گھی سے تر

گر رہی تھی مکھیوں کی فوج جن پر ٹوٹ کر

ریل کے محدود ڈبے اس طرح لبریز تھے

بند ہوں ڈربوں میں جیسے مرغیوں کے قافلے

وہ تپش تھی جسم پر چپکے ہوئے تھے پیرہن

بھیگی بھیگی ساریوں میں برق افشاں تھے بدن

ایک ڈبے میں تھا دیہاتی کے حقے کا دھواں

پاس دو سکھ ناک پر رکھے ہوئے تھے انگلیاں

کوئلے سے چند بچوں کی تھیں آنکھیں لال لال

گھورتے تھے کچھ پھلوں کو بہہ رہی تھی منہ سے رال

اس کے جیسی اور بھی کلیاں تھیں لیکن وہ نہ تھی

اور بھی مصری کی کچھ ڈلیاں تھیں لیکن وہ نہ تھی

کیا خبر تھی یوں مجھے آوارہ سر کر جائے گی

آنکھ کے رستے اتر کر دل میں گھر کر جائے گی

آج تک اس کے تعاقب میں پریشاں ہے نظر

آج تک میرے خیالوں میں ہے اُسکی رہگذر

اتنی تسکیں ہے وہ عشوہ گر جہاں بھی جائے گی

مڑ کے دیکھے گی تو مجھ کو اپنے پیچھے پائے گی

"اس نظم میں" ۲۲ر نومبر ۴۱ء

محمد حسین خوش نویس گوجرانوالہ